UNIVERSAL
LIBRARY
OU_224538
UNIVERSAL
LIBRARY

OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY

Call No. ۱۰۷/ر۔ف

Name of Book فلسفۂ جمال

Name of Author ریاض الحسن

فلسفۂ جمال

ریاض الحسن - ایم - اے

الہ آباد

ہندستانی اکیڈیمی، یو۔ پی

۱۹۳۵

Published by
THE HINDUSTANI ACADEMY, U. P.
Allahabad.

FIRST EDITION
Price Re. 1.

Printed by
M. Ghulam Asgher, at the City Press,
Allahabad.

فہرست مضامین

۱ - فلسفۂ جمال ۱

۲—حسن اور آرٹ ۱۸

۳—ہم آہنگی و وحدت ۴۳

۴—حسین اور بدصورت کا تعلق ... ۴۷

۵—صاحب فن کی بزرگی و عظمت ... ۵۸

۶—آرٹ اور اخلاق ۶۵

فلسفۂ جمال

انسان کی سرشت میں مختلف قسم کی صلاحیتیں پیدا کی گئی ہیں وہ جن سے حسب ضرورت کام نکالتا ہے مثلاً پیاس لگتی ہے تو پانی کے لئے دوڑتا ہے، سردی لگتی ہے تو کپڑے کی فکر کرتا ہے اور اگر کوئی حملہ کرتا ہے تو اس کے بچاؤ کی تدبیر کرتا ہے وغیرہ وغیرہ - ان افعال میں ایک فائدہ ہے جس کے حاصل ہونے کے بعد انسان کو یک گونہ سکون ہوجاتا ہے - لیکن ایک صلاحیت ایسی بھی ہے جس کو فائدہ سے کوئی واسطہ نہیں غرض سے کوئی تعلق نہیں - اس کے اثر سے انسان ایسی حرکات کرتا ہے جس کو اصطلاح میں "بیکار" کہہ سکتے ہیں یعنی اس سے کوئی فائدہ مترتب نہیں ہوتا، نہ سود کی تمنا اور نہ زیاں کی پرواہ ہوتی ہے کیونکہ انسان اس وقت عالم خارجی کو اپنے دل میں چھپا لینے کی خواہش کرتا ہے اور اس میں اس کو روحانی مسرت ملتی ہے، سرور ملتا ہے اور یہی سرور ان حرکات کا سب سے بڑا صلہ ہے -

دریا کے کنارے شام کی شفق کا عکس جب پانی میں دیکھتا ہے تو صبر و قرار کھو بیٹھتا ہے یا کبھی موسم بہار کی کسی رنگین صبح کو جب صبا کی مست خرامی کے ساتھ نونہالان چمن کو ایک طرف مصروف رقص اور دوسری طرف غنچہ و گل کو خنداں و متبسم دیکھتا ہے تو بے اختیار ہو جاتا ہے - کبھی ایک نامعلوم جذبہ سے بیتاب ہوکر ابر شفق آلودہ کو اپنے ہی دل کا خون ہونا سمجھتا ہے اور کبھی بلبل کے نغموں میں

اپنا ہی نالۂ درد سنتا ہے - اس وقت دل میں ایک خلش محسوس کرتا ہے جس سے خود دل کو لطف ملتا ہے اور اس کیفیت کے ماتحت وہ ہر اس شے کو جس کی طرف اس کی طبیعت راغب ہوتی ہے "حسین" کہتا ہے - یہ حسین کیا اور حسن کیا ہے ؟

والٹر پیٹر کا قول ہے کہ حسن کی جامع تعریف ناممکن ہے کیونکہ حسن محض ایک انفرادی کیفیت کا نام ہے جس سے عام قیاس نہیں کیا جاسکتا ہے - لیکن اس امر سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ صرف عام میں کتنی ہی چیزیں حسین کہی جاتی ہیں - مثلاً صحن چمن میں روے گل کو کون حسین نہیں کہیگا - پھر دریا کا پر فضا کنارہ ، شام کی شفق ، صبح کا روے خنداں ، کہسار کا دلفریب نظارہ ، باغ کی بہار - ایک چابکدست مصور کا شاہکار - ایک مشہور سنگتراش کا مجسمہ وغیرہ - غرض کتنی ہی ایسی چیزیں ہیں جن سے حسن کا خیال وابستہ ہے - تو کیا حسن ان اشیاء میں خارجی طور پر پہلے سے موجود ہے یا ہمارے جوش تخیل و شدت احساس کا نتیجہ ہے ؟

حسن اور تخیل

ہم جب کسی 'حسین' چیز کو دیکھتے ہیں تو اس کا اثر پہلے ہمارے حواس پر پڑتا ہے - پھر دل ایک کشش محسوس کرتا ہے اور جب اس کشش کے ماتحت ہم اپنے احساس اور خارجی منظر میں یگانگت پیدا کر دیتے ہیں تو ہم کو مسرت ہوتی ہے - یہ یگانگت تخیل سے پیدا ہوتی ہے - تخیل روح کا ایک فعل ہے جس کی مدد سے روح اپنی پوری آزادی کے ساتھ اپنے پرانے تجربوں کو زندہ کرتی ہے اور احساس کے ذرا ذرا سے ٹکڑوں کا جائزہ لیتی ہے - روح کا یہ فعل حواس سے شروع ہوکر تخیل و تفکر پر ختم ہوتا ہے مثلاً باغ کی

ٹھنڈی ہوا ' جنگل کا پر سکون منظر ' کوئل کی کوکو ' مصوری کا ایک عمدہ نمونہ وغیرہ یہ چیزیں جب آپ کے سامنے آتی ہیں تو پہلے حواس پر اپنا اثر کرتی ہیں - پھر آپ ان سے بقدر تخیل محظوظ ہوتے ہیں اور ان کو 'حسین ' کہنے لگتے ہیں - اگر آپ کا تخیل بلند ہے تو آپ کے احساس میں اور شدت پیدا ہوجائیگی - مثلاً جب آپ کے سامنے غالب کا یہ شعر پڑھا جائے -

پر تو خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم
ہم بھی ہیں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

تو آپ صبح کی بھینی بھینی خوشبو کے ساتھ برگ گل پر قطرۂ شبنم کا خیال کریں گے ' پھر سورج کی کرنوں کے اثر سے شبنم کا اڑ جانا یا فنا ہونا آپ کے ذہن میں آئیگا - جس طرح شبنم کا قطرہ غائب ہوجاتا ہے اسی طرح آپ اس عالم فانی سے جو چمن کے مانند ہے کسی بلند ہستی کی 'عنایت ' سے زندگی کے آخری سفر پر غور کرکے لطف اٹھائیں گے - آپ یہ چیزیں دیکھ نہیں رہے ہیں مگر تخیل چشم زدن میں یہ سارا نقشہ آپ کے سامنے لاکر رکھ دیگا - اس وقت یقیناً آپ پر ایک روحانی مسرت کی کیفیت طاری ہوگی جس کو ہم جذبۂ حسن کی بیداری سے تعبیر کرسکتے ہیں - معلوم ہوا کہ حسن ایک روحانی کیفیت کا نام ہے جو حواس ' تخیل اور تفکر کے باہمی امتزاج سے مترتب ہوتا ہے -

حواس پر جو چیز اثر کرتی ہے ہم کو اس کے فائدہ یا نقصان سے کوئی غرض نہیں ہوتی بلکہ ہم کو صرف اس کی ظاہری صورت سے مطلب ہوتا ہے - ہم گلاب کو اس نیت سے نہیں دیکھتے کہ اس کی جڑ میں

کون سی کھاد پڑی ہے یا اگر فلاں قسم کی مٹی بہم پہونچائی جائے تو پھول اور بڑا ہوگا اور اس سے زیادہ عرق نکلے گا بلکہ اس کی ظاہری صورت سے بغیر کسی سود و زیاں کے خیال کے متاثر ہوتے ہیں اور اس کی نرم و نازک پتیوں میں اپنے دل صد چاک کی داستان پنہاں دیکھتے ہیں اور مسرور ہوتے ہیں - بادل کو لیجئے - ہم تو صرف بادلوں کی رنگینی ' اور ان کی مختلف اشکال کا جلوہ دیکھتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں - ہم کو اس سے کیا بحث کہ ان میں پانی کے قطرے چھپے ہوئے ہیں اور ایک خاص درجۂ رطوبت پر وہ زمین کو سیراب کرتے ہیں - ہم کو تو ان کی ظاہری صورت ہی میں لطف ملتا ہے جو ہم نے اپنے تخیل سے قائم کی ہے - لطف و انبساط کی اس کیفیت کا نام احساس جمال ہے - ایک خاص بات اس احساس میں یہ ہوتی ہے کہ اس کا ایک گوشہ ہمیشہ اشیاء محسوسہ سے ملا ہوتا ہے - جیسے سمندر میں کھرے کی کیفیت ہوتی ہے کہ باوجود بلند ہونے کے سطح آب سے ملا ہوتا ہے اسی طرح احساس جمال باوجود بلندی تخیل کے خارجی شے سے ملا ہوتا ہے کیونکہ تحریک ہمیشہ خارجی اشیاء سے پیدا ہوتی ہے - مان لیجئے کہ آپ کسی وجہ سے رنجیدہ ہیں تو آپ دل پر ایک بوجھ محسوس کرینگے ' ایک خلش رہ رہ کر آپ کو پریشان کریگی اور جس چیز سے آپ کو یہ تکلیف پہونچی ہے وہ برابر آپ کے ذہن میں رہیگی - اس تکلیف میں آپ کا احساس معمولی درجہ کا ہوگا لیکن اگر اس درد کی حالت میں تخیل نے آپ کو چھوڑ دیا تو آپ سراپا درد بن جائیں گے - احساس شدید اور تیز ہوجائیگا اور آپ کے دل پر نئی نئی کیفیتیں طاری ہوں گی - وہ رنج و غم اب بالکل ایک دوسری صورت میں نظر آئے گا اور اس میں نئے نئے معانی اور مطالب پیدا ہوجائیں گے - اقبال نے ' والدہ مرحومہ کی یاد میں ' ایک

مرثیہ لکھا ہے - اول اول والدہ مرحومہ کے غم میں اقبال کی آنکھیں اشکبار ہیں پھر ان کو اپنا عہد طفلی اور مادر مرحومہ کی تربیت اور شفقتوں کا خیال آتا ہے تو نشتر غم کی نوک خاصی تیز ہوجاتی ہے -

تجھ کو مثل طفلک بیدست و پا روتا ہے وہ
صبر سے نا آشنا صبح و مسا روتا ہے وہ

لیکن جب تخیل اقبال کو ایک بلند مقام پر لیجاتا ہے جہاں موت و حیات کی عالمگیر حقیقت اور کائنات کے قوانین پر نظر ہوتی ہے تو درد و اثر اور بڑھ جاتا ہے - جو خیال اول والدہ مرحومہ کی یاد سے پیدا ہوا تھا اب وہ سارے عالم پر چھا گیا -

آہ ! یہ دنیا ' یہ ماتم خانۂ برناؤ پیر
آدمی ہے کسی طلسمِ دوش و فردا میں اسیر
زلزلے ہیں ' بجلیاں ہیں ' قحط ہیں ' آلام ہیں
کیسی کیسی دخترانِ مادرِ ایام ہیں
کلبۂ افلاس میں ' دولت کے کاشانے میں موت
دشت و در میں شہر میں گلشن میں ویرانے میں موت
نے مجال شکوہ ہے ' نے طاقت گفتار ہے
زندگانی کیا ہے اک طوقِ گلو افشار ہے

زندگی کی داستان کے بعد ذرا موت کی حقیقت بھی سن لیجئے :—

زندگی کی آگ کا انجام خاکستر نہیں
ٹوٹنا جس کا مقدر ہو ' یہ وہ گوہر نہیں

خوگــر پرواز کو پرواز میں ڈر کچھ نہیں
موت اس گلشن میں جز سنجیدن پر کچھ نہیں

اسی طرح خزاں میں پتیوں کے گرنے اور بہار میں نئی نئی کونپلوں کے نکلنے کو سب دیکھتے ہیں لیکن جوش تخیل سے شاعر اسی چیز میں معنی پیدا کرتا ہے اور اس عالم کے انقلاب کی داستان بیان کرتا ہے - اکبر کا شعر ہے :—

بہار آئی خزاں آئی خزاں آئی بہار آئی
سدا ہم نے بدلتا رنگ دیکھا اس گلستاں کا

آتش کا شعر :—

ہوائے دور مئے خوشگوار راہ میں ہے
خزاں چمن سے ہے جاتی بہار راہ میں ہے

یا انگریزی کے مشہور شاعر شیلے کا یہ مصرع :—

آتی ہے خزاں تو آنے دو پر ہم سے بہار اب دور نہیں

نہ صرف موسمی انقلاب کی طرف اشارہ کرتے ہیں بلکہ یہ بھی بتاتے ہیں کہ زندگی نام ہے انقلاب کا تغیر کا اور زمانہ کے بدلنے کا -

جب ہم کسی خارجی شے کو دیکھتے ہیں تو تخیل بہ‌تقاضاے انبساط ایک ایسا خیالی ہیولا قائم کردیتا ہے جس کی بنیاد اسی خارجی شے پر ہوتی ہے - یہ ہیولا جیسا میں بتا چکا ہوں سمندر کے کہرے کی طرح اپنی بنیاد سے علیحدہ بھی ہوتا ہے اور ملا ہوا بھی - علیحدہ اس صورت سے کہ یہ خارجی شے نہیں ہے اور ملا اس صورت سے کہ خارجی شے کے اثر سے پیدا ہوا ہے - یہ خیالی ہیولا گویا روح کا ایک عکس ہے جو خارجی اشیاء پر پڑتا ہے اور چونکہ یہ روح ہی کا ایک عکس ہے اس لئے

روح کی تمنائیں اور آرزوئیں اس ھیولا میں نظر آتی ھیں - روح اس ھیولا کا تصور کرکے مسرور ھوتی ھے - روح کو ایک ایسے عالم کی تلاش ھوتی ھے جہاں اس عالم آب و گل کی ناکامیاں اور بے عنوانیاں موجود نہ ھوں - جہاں شمع کا سوز پروانہ کو بیقرار نہ کرتا ھو - جہاں تکلیف و آرام کا قانون ھی کچھ اور ھو - جہاں زھر کی تلخی اور کانٹے کی چبھن محسوس نہ ھو - جہاں اشیاء اور ماحول میں بجائے تخالف و تنازع کے یکجہتی اور ھم آھنگی ھو - ظاھر ھے کہ یہ منظر اس چتر نیلگوں کے نیچے کہیں نہیں مل سکتا مگر اس کے باوجود روح کو اس کی آرزو اور تلاش رھتی ھے اور اس تلاش میں وہ سرگرداں رھتی ھے - آخر اس عالم کی بےعنوانیاں سے متاثر ھوکر وہ ایک عالم مثال جو سراسر تخیلی ھوتا ھے تلاش کرلیتی ھے - وھاں ھر چیز عالم آب و گل سے مختلف ھوتی ھے - وھاں دشمنی اور عداوت کے بجائے ایثار و محبت کا سکہ چلتا ھے اور وھاں کا قانون روح کی خواھش کے مطابق ھوتا ھے - چونکہ اس عالم مثال یا تخیلی ھیولا میں روح کی خواھشیں اور آرزوئیں پوری ھوتی ھیں اس لئے اس ھیولا کا تصور روح کو مسرور کرتا ھے - اس حالت میں روح اور ھیولا دو علحدہ چیزیں نہیں ھوتیں بلکہ ایک ھی چیز ھوتی ھے - مگر واضح رھے کہ اس عالم مثال کا تصور اس عالم آب و گل ھی کی بنیاد پر قائم ھے - اس لحاظ سے اس ھیولا میں جو روح کا ایک خارجی عکس ھے بہ‌یک وقت خارجی اشیاء، تخیل اور تصور کی کیفیات موجود ھوتی ھیں اور اسی ھیولا کا نام حسن ھے - جمالیات کی اصطلاح میں اس کو جمالیاتی اظہار کہتے ھیں کیونکہ روح خود اپنی خواھش جمال کو ایک خیالی ھیولا کے ذریعہ ظاھر کرتی ھے - اس ھیولا کا اظہار جب رنگ، صورت یا آواز میں ھوتا ھے تو اس کوفن یا آرٹ کہتے ھیں -

اس تخئیلی ہیولا کے تین جزو ہوتے ہیں - اول خارجی اشیاء پر تخیل کا اثر ہونا دویم اس ہیولا پر تصور یا تفکر کا عمل ہونا اور سوئم اس تخئیلی ہیولا میں معلویت اور قدر کا پیدا ہونا - تخیل اور تصور کا ذکر اوپر ہوچکا ہے اب دیکھنا یہ ہے کہ اس ہیولا میں قدر کہاں سے آتی ہے - قدر درحقیقت ہیولا میں نہیں ہوتی بلکہ روح خارجی شے کی مدد سے خود قدر کی تخلیق کرتی ہے - ساز کے مختلف تاروں سے جو نغمے نکلتے ہیں ان سے ایک انبساط کی کیفیت پیدا ہوتی ہے - یہ کیفیت یا قدر بالکل روحانی چیز ہے لیکن بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ساز ہی سے خوشی و مسرت کا چشمہ ابل رہا ہے - بات یہ ہے کہ خارجی شے اور تخیل میں جیسا میں نے کہا ہے ایک طرح کا اتحاد ہوتا ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نغمہ کا یہ کیف تاروں ہی سے نکل رہا ہے اور جب یہ اتحاد شکست ہو جاتا ہے تو وہ کیفیت بھی غائب ہو جاتی ہے - ہم کو نغموں میں کیوں لطف ملتا ہے ؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب ہماری روحانی خواہش اور رجحان کو اس سے تسکین ہوتی ہے تو ہم سمجھتے ہیں کہ نغمہ میں قدر پوشیدہ ہے -

حسن کے اجزاے سہ گانہ

ارباب علم نے قدر کے تین نظریئے بیان کئے ہیں - اول یہ کہ قدر خود اشیاء کی صفت ہے اور یہ صفت بغیر روح کے احساس کے اس کے اندر موجود ہے - اس کی مثال یہ ہے کہ شفق میں خود حسن موجود ہے - دریا کی روانی خوبصورت ہے اس لئے دل اس طرف کھنچتا ہے - لیکن یہ نظریہ صحیح نہیں کیونکہ روح میں احساس کا ملکہ نہ ہو تو پھر دنیا کی کون سی چیز حسین ہونے کا دعوی کر سکتی ہے ! دوسرا نظریہ یہ ہے کہ قدر سراسر ایک روحانی فعل ہے اور محض روح ہی اسکی خالق ہے - یہ نظریہ بھی درست نہیں کیونکہ ہم خارجی اشیاء کی طرف

راغب ہوتے ہیں، اِن سے محظوظ ہوتے ہیں، لطف اُٹھاتے ہیں اور انہیں حسین کہتے ہیں - تیسرا نظریہ یہ ہے کہ قدر ایک اضافی چیز ہے جو روح اور خارجی اشیاء کے آپس میں اتحاد سے پیدا ہوتی ہے یعنی قدر تنہا کسی غیر ذی روح اشیاء میں ہوہی نہیں سکتی بلکہ یہ نام ہے ایک روحانی فعل کا جو کسی خارجی شے کی تحریک سے پیدا ہوا ہے - دوسرے الفاظ میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ قدر کی حیثیت کل کی ہے جس سے روح اور خارجی اشیاء میں ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے -

قدر کی دو قسمیں ہیں - ایک جسمانی دوسری روحانی - روحانی قدر یقیناً جسمانی قدر سے اونچے درجے کی ہوتی ہے اور اعلیٰ قدر یہی ہے - جسمانی قدر کی مثال یوں ہو سکتی ہے کہ آپ کو پیاس لگی ہے - اندر سے ایک طرح کی خواہش پیدا ہوئی اور اس خواہش کے پورا کرنے کے لئے طبیعت بے چین ہے - مان لیجئے کہ آپ نہیں جانتے کہ پیاس کا علاج پانی ہے یا پانی میں پیاس بجھانے کی صلاحیت موجود ہے - اس حالت میں آپ کے سامنے کچھ کچے پھل یا اور کوئی چیز رکھ دی جائے تو آپ تجربہ کریں گے مگر آپ کی پیاس نہ جائیگی - پھر آپ کے سامنے ایک رقیق سیال چیز آتی ہے - آپ اسے پی جاتے ہیں اور پیتے ہی ایک طرح کی مسرت اور تسکین محسوس کرتے ہیں جو کسی دوسری چیز سے نہ ہوتی - آپ سمجھتے ہیں کہ پانی میں قدر موجود ہے لیکن در اصل پانی میں کوئی قدر نہیں - قدر تو آپ کی خواہش کے پورا ہونے میں ہے یعنی خواہش اور چیز دونوں کی ہم آہنگی میں - یہ تو جسم کا حال ہوا مگر یہی حال روح کا بھی ہے - روح کو بھی پیاس لگتی ہے - خواہش ہوتی ہے - اس کو بھی خورد و نوش کی ضرورت ہوتی ہے - مگر اس کی خورد و نوش کی صورت

دوسری ہے - مثلاً روح کو بلندی کی خواہش ہوتی ہے یعنی وہ اپنے ماحول سے بلند ہونا چاہتی ہے - اس کو ایک ایسے عالم کی آرزو ہوتی ہے جہاں پہونچ کر انسان زندگی کے آلام و مصائب کو بھول جائے ' اور جہاں اس زندگی کا راز معلوم و منکشف ہو جائے یہ خواہش شاعری ' مصوری یا موسیقی وغیرہ سے پوری ہوتی ہے - روح اپنی خواہش پرواز کو پورا کرنے کے لئے ایک ذریعہ تلاش کر لیتی ہے - یعنی یہ خواہش بغیر کسی خارجی شے کی مدد کے پوری نہیں ہو سکتی - اس خارجی شے کی بنا پر تخیل ایک ہیولا قائم کرتا ہے اور اس ہیولا میں روح اپنی نا آسودہ تمناؤں اور آرزؤں کی کامیابی محسوس کرتی ہے اور اس کامیابی کے تصور سے مسرور ہوتی ہے - اس لئے صحیح قدر نام ہے صرف اس تعلق کا جو روح کو اپنی تسکین کے لئے کسی خارجی شے کے ساتھہ ہوتا ہے - یعنی قدر ہم خود تخیل کے زور سے خارجی اشیا کے ذریعہ پیدا کرتے ہیں - اس وقت گویا ہمارا باطن ایک خارجی صورت اختیار کر لیتا ہے اور روح خارجی مناظر کو اپنے رنگ میں رنگ دیتی ہے اور ہم یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ خارجی مناظر میں حسن ہے ' قدر ہے حالانکہ حسن تو ہم خود پیدا کرتے ہیں - درحقیقت نہ پھول ہنستے ہیں اور نہ شبنم روتی ہے - جب ہم ہنسنا چاہتے ہیں تو ہم کو ہر پھول ہنستا ہوا معلوم ہوتا ہے اور جب رونے کی تمنا ہوتی ہے تو ہر قطرۂ شبنم آنسو کا قطرہ معلوم ہوتا ہے - اس وقت پپیہے کی پی پی میں اپنے ہی فراق و ہجر کی صدائے باز گشت سنائی دیتی ہے - غالب کا شعر ہے :—

غنچہ پھر لگا کھلنے آج ہمنے اپنا دل
خون کیا ہوا دیکھا گم کیا ہوا پایا

غالب کو غنچہ کے کھلنے میں اپنا خون شدہ دل نظر آتا ھے - غنچہ کی شوخی ' اس کی سرخی اور اس کی چاک دامانی کی نہ صرف دل سے مشابہت ھے بلکہ انہوں نے غنچہ کی بنا پر دل کا جو ھیولا اپنے ذھن میں قائم کیا وہ بالکل غنچہ کے اثر سے جاکر مل گیا اور اس اثر سے متاثر ھوکر وہ کہہ اٹھے -

غنچہ پھر لگا کھلنے آج ھمنے اپنا دل * خون کیا ھوا دیکھا گم کیا ھوا پایا

اور اندرونی کیفیت نے ' غنچہ ' کی شکل میں خارجیت اختیار کر لی - پھر غنچہ میں وہ تمام قدور نظر آنے لگے جو صرف دل کا حصہ تھے حالانکہ بظاھر غنچہ اور دل میں دور کا واسطہ بھی نہیں - اسی طرح موسیقی کی ایک لے میں بظاھر آواز کا زیر و بم سنائی دیتا ھے مگر معلوم ایسا ھوتا ھے کہ دل کی ساری تمنائیں اور دل کا سارا راز اس ایک لے میں شامل ھے - روح ' خارجیت ' کے ساتھ جو رشتہ قائم کرتی ھے اس کی کیا نوعیت ھے ؟ اس کو سمجھنے کے لئے خارجی اشیا کے حسب ذیل پہلوؤں پر نظر رکھنا ضروری ھے -

خارجي اشیا کے دو پہلو

اشیائے مدرکہ جو بظاھر ھمارے حواس پر اول اول اپنا اثر ڈالتی ھیں ان کے دو پہلو ھوتے ھیں اول تو ان کا حسی پہلو جیسے رنگ ' آواز ' خوشبو وغیرہ - دوم ان کا صوری پہلو جیسے خط ' جسم اور راگ وغیرہ - ان دونوں پہلوؤں کو صرف بحث کے لئے علیحدہ کر لیا گیا ھے تاکہ مسئلہ آسانی سے ذھن نشیں ھو جائے ورنہ درحقیقت کسی شے کے ان دونوں پہلوؤں کو الگ کرنا مشکل ھے - پھر ان چیزوں کا ھم پر بلا واسطہ اور بالواسطہ اثر پڑتا ھے - پہلے بلا واسطہ حسی اثر کو لیجئے - بعض اصحاب کا خیال ھے کہ اشیاء کا حسی اثر ھم پر اس وقت تک بالکل نہیں پڑتا جب تک کہ

ان کی کوئی صورت بھی نہ ہو - مثلاً خالی رنگ کوئی چیز نہیں لیکن یہی رنگ جب کسی تصویر میں نمودار ہوتا ہے تو اسمیں قدر پائی جاتی ہے اور دل بے اختیار ایک کشش، ایک جاذبیت محسوس کرتا ہے - یہی بات آواز کے لئے بھی کہی جاسکتی ہے یعنی محض آواز بے معنی اور بے قدر چیز ہے لیکن جب تال اور سر کے ساتھ ادا کی جائے تو اس میں نغمہ پیدا ہوتا ہے - لیکن یہ بیان صحیح نہیں ہے - اگر رنگ یا آواز کو صرف حسی پہلو سے دیکھا جائے تو اس میں کسی حد تک قدر ضرور شامل ہوتی ہے - یعنی آواز کو اگر نغمہ سے الگ کردیں تب بھی کچھ، نہ کچھ اثر ضرور ہوگا کیونکہ ہمارے اعصاب میں اثر پذیری کا مادہ موجود ہے - مان لیجئے کہ ایک شخص خوش الحانی کے ساتھ بنگالی زبان کی نظم پڑھ رہا ہو - آپ اگر بنگالی زبان سے ناواقف ہیں تو آپ نغمہ کا لطف پوری طور پر نہ اٹھا سکیں گے لیکن جہاں تک صرف آواز کا تعلق ہے آپ پر اس کا اثر پڑیگا اور ممکن ہے آپ محظوظ بھی ہوں - آواز میں کبھی درد ہوتا ہے، کبھی مسرت اور شگفتگی پائی جاتی ہے، کبھی بیگانگی و بے مہری کا رنگ جھلکتا ہے - کبھی تلوار کی تیزی نمایاں ہوتی ہے کبھی زہر و تریاق کا اثر پیدا ہوتا ہے - غرض آواز سے کتنے معنی نکلتے ہیں - اسی طرح رنگ کے بھی زبان ہوتی ہے - وہ باتیں کرتے ہیں اور آپ پر اپنا اثر ڈالتے ہیں - گلابی رنگ جذبات کو ابھارتا ہے، نارنجی دل کو تقویت بخشتا ہے اور سبز مفرح ہوتا ہے لیکن حسی پہلو میں جو قدر پائی جاتی ہے اس میں تلازمہ کا اثر بھی ہوتا ہے - یعنی گلابی رنگ دیکھکر آپ کو کسی گلابی کپڑے کا یا بگل سن کر فوجی پریڈ کا خیال آئے گا اور آپ محظوظ ہوں گے - اگر تلازمہ کو علیحدہ کردیا جائے تو بعض محققین نفسیات کا خیال ہے کہ رنگ اور آواز کا تنہا اثر بھی پڑتا ہے -

اسی طرح کسی شے کے صوری پہلو کا اثر بھی ہمارے اوپر ہوتا ہے - صورت نام ہے ترتیب کا ، نقشہ کا ، نظام اور ساخت کا - اگر ہم کسی چیز کے صرف صوری پہلو پر نظر ڈالنا چاہیں تو تھوڑی دیر کے لئے اس کے حسی پہلو کو الگ کردینا ہوگا - کسی تصویر کے صوری صفات اس وقت بہتر طریقہ پر ذہن نشین ہوسکتے ہیں جب رنگ کا خیال علحدہ کردیا جائے - اس وقت صرف خطوط اور ترتیب میں بھی کچھ، نہ کچھ قدر معلوم ہوگی - مثلاً سیدھی لکیر سے استقامت اور بڑی لکیر سے توازن کا اندازہ پایا جاتا ہے بعض تیڑھی اور ترچھی لکیریں روانی اور بہاؤ کی طرف اشارہ کرتی ہیں - حسی پہلو کی طرح صوری پہلو میں بھی تلازمہ کو کافی دخل ہے یعنی ایک چیز کو دیکھکر کسی دوسری چیز کی یاد آنا جس سے پہلے احساس کو کوئی تعلق رہا ہو - لیکن اونچے درجہ کی قدر اس وقت ہوتی ہے جب کسی چیز کے حسی اور صوری پہلوؤں کا بہ یک وقت اثر ہو - معمولی صدا کو لیجئے - اس میں اثر ضرور ہوتا ہے لیکن اس کو جب خاص نظام کے ماتحت راگ میں ڈھال دیتے ہیں تو اس کا اثر کہاں سے کہاں پہونچ جاتا ہے -

یہ تو اشیاء کا براہ راست یا بلا واسطہ اثر ہوا - اب ذرا بالواسطہ اثر کو بھی لیجئے - بالواسطہ اثر میں حافظہ کو زیادہ دخل ہے - یعنی آپ نے کسی چیز کو دیکھا اور اس کا اثر دماغ میں محفوظ ہوگیا - اب آپ جب کوئی دوسری جیز ایسی دیکھیں گے جس کا اثر اس پہلی چیز کے اثر سے مل جائے گا تو آپ خود اپنی طبیعت کے لحاظ سے قدر پیدا کریں گے - اس طرح قدور پیدا کرنے میں ہر قسم کے شخصی و اجتماعی تجربات کو دخل ہوتا ہے - آپ کا شخصی تجربہ ہے کہ آگ کے شعلوں میں سرخی اور گرمی پائی جاتی ہے - آپ جب کوئی چیز سرخ

اور گرم دیکھیں گے تو آپ کا خیال آگ کی طرف جائے گا - پھر اسی طرح سبزہ دیکھنے کے بعد بہار و گلشن کا یا کسی کي سبز قبا کا خیال آئے گا - اور پھر آپ اپنے گذشتہ تجربہ کی بنا پر مسرور ھوں گے - اجتماعي تجربہ کی مثال وہ تجربہ ھے جس کو عام طور پر لوگ محسوس کرتے ھیں یا کرچکے ھیں الفاظ میں چونکہ یہ صلاحیت سب سے زیادہ ھوتی ھے کہ وہ گذشتہ تجربوں کو زندہ کرتا ھے اس لئے الفاظ کے ذریعہ اگر کسی تجربہ کا ذکر کیا گیا تو وہ چیز فوراً ھر شخص کے سامنے آجائیگی - مثلاً اگر شعر میں گرمی کي شدت ' لوؤں کی لپٹ ' باد صرصر کے طوفانوں کا ذکر ھے تو لوگ گرمی کی لفظی تصویر دیکھ کر فوراً سمجھ جائیں گے اور اس سے لطف اٹھائیں گے کیونکہ یہ ان کا ایک تجربہ ھے خواہ تلخ ھی کیوں نہ ھو واضح رھے کہ ان چیزوں سے قدر اسی وقت پیدا ھوگی جب خارجی شے میں جسے آپ دیکھ رھے ھیں یہ صلاحیت ھو کہ وہ آپ کے دماغ کے کسی محفوظ شدہ علم میں جاکر مل جائے - اگر آپ نے گرمی کی تکلیف نہیں اٹھائی ھے تو آپ کو گرمی کا حال پڑھ کر لطف نہیں آئے گا - یعنی خارجي اور باطنی اثر میں ایک طرح کی موزونیت اور ھم آھنگی ھونی چاھئے - اگر یہ صورت ممکن نہیں ھے تو قدر غائب ھو جائے گی اور ساتھ ساتھ حسن بھی - خارجی اشیاء کی یہ موزونیت خود ھماری پیدا کی ھوئی ھے - ھم خوش ھیں تو سبز رنگ سے فرحت ھوگی کیونکہ سبز رنگ ھماری اندرونی خوشیوں کا مظہر ھے - اسی طرح سیاہ رنگ سے اس لئے تکلیف ھوتی کہ رات کی تاریکی ھمارے درد و غم کا مظہر ھے - ھم نے اپنے درد و غم کو ' سیاھی ' کی شکل میں ایک خارجیت عطا کی ھے اگر ھمارا دل

پریشان و متفکر ہے تو تنہا و تاریک گوشہ میں اس کو سکون ملے گا اس لئے نہیں کہ تاریکی کو اس نے اپنا ہمدم بنا لیا ہے بلکہ خود تاریکی ہمارے اندرونی جذبات کی ترجمان بن گئی ہے اور اس لئے اس کی ہمدمی میں ہم کو لطف ملتا ہے -

تلازمہ کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ جس چیز کو دیکھ کر کسی دوسری چیز کا خیال آئے اور جذبات ابھریں اس چیز میں موزوں طور پر اس دوسری چیز کی طرف اشارہ کرنے اور جذبات کو ابھارنے کی صلاحیت پائی جائے - اقبال کی دو نظموں کو لیجئے - اول صقلیہ - دوم گورستان شاہی - صقلی کا جزیرہ دیکھ کر خیال عرب کی پرانی حکومت ' مسلمانوں کے عروج ان کے بحری کارناموں اور تہذیب کی ترقی میں ان کی کوششوں کی طرف جاتا ہے - اور اس تمام احساس کو زندہ کرتا ہے جو تاریخ سے ہم تک پہونچا ہے - ظاہر ہے کہ صقلیہ میں عربوں کی پرانی تہذیب کی طرف موزوں طور پر اشارہ کرنے کی صلاحیت بدرجہ اتم موجود ہے کیونکہ یہ جزیرہ عربوں کی ترقی کا مرکز رہ چکا ہے - اس نظم سے ایک قدیم ماحول قائم ہوگیا حالانکہ خود صقلیہ میں آج ایسی کوئی چیز نہیں - یہ قدر جو اس میں موجود ہے خود ہماری داخل کی ہوئی ہے - اب اگر کوئی مصور اس کی تصویر بنائے تو صقلیہ کے سمندر میں عربی وضع کی کشتیاں دکھائے گا - ساحل کے مکانات بالکل عربی وضع کے ہوں گے اور سڑک پر چلنے والے بھی عربی جبہ زیب تن کئے ہوں گے - در اصل یہ صقلیہ آج کل کا صقلیہ نہ ہوگا بلکہ ہزار سال قبل کا صقلیہ ہوگا جس میں تخیل نے قدر پیدا کرکے حسین بنا دیا ہے - یہی حال ' گورستان شاہی ' کا ہے - گورستان کا خیال کوئی خوبصورت خیال نہیں ہوتا - اس کی

آغوش میں موت کا بھیانک ہاتھ پھیلا ہوتا ہے جو ہر ذی روح کو دعوت مرگ دیتا ہے - لیکن جب ان ٹوٹے پھوٹے مزارات پر تخیل اپنا کام کرتا ہے تو ہماری نظر میں وہ اینٹ اور پتھر کا ڈھیر نہیں ہوتے بلکہ ایک " برگشتہ قسمت قوم کا سرمایہ " بن جاتے ہوں اور ان میں ہمیں صاحبان مزار کے وہ کارهائے نمایاں نظر آتے ہیں جس سے ایک زمانہ اِن کا مطیع تھا -

سوتے ہیں خاموش آبادی کے ہنگاموں سے دور
مضطرب رکھتی تھی جن کو آرزوے ناصبور
قبر کی ظلمت میں ہے ان آفتابوں کی چمک
جن کے دروازوں پہ رہتا تھا جبین گستر فلک

اس طرح تخیل ان اینٹوں اور پتھروں سے ایک نئی دنیا تعمیر کرتا ہے اور اس کے خیال سے پھر تصور خوش ہوتا ہے کیونکہ موجودہ دور کی بیکسی و کس‌مپرسی کا علاج ماضی میں ملتا ہے - اس طرح ہماری آزادی و اقتدار کی خواهش کو اس ملبہ میں سکون ملتا ہے اور اس سکون کے بعد ہم سمجھنے لگتے ہیں کہ اس ملبہ میں قدر پوشیدہ ہے - جہاں تک بالکل شخصی تجربہ کا ذکر ہوتا ہے یہ قدر ذاتی ہوتی ہے لیکن جب کوئی محسوس کرنے والا کسی خاص ذاتی اثر کو ایک عالمگیر اثر کے مانند لاتا ہے تو بڑا صاحب نظر یا صاحب فن کہا جاتا ہے - مثلاً اقبال کا داغ والا مرثیہ لیجئے شروع میں شاعر نے اپنے تاثرات لکھے ہیں لیکن آخر میں جو نتیجہ نکالا ہے وہ ایک عالمگیر حیثیت اختیار کر لیتا ہے یعنی :—

کھل نہیں سکتی شکایت کے لئے لیکن زبان
ہے خزاں کا رنگ بھی وجہ قیام گلستان

ایک ہی قانون عالمگیر کے ہیں سب اثر
بوئے گل کا باغ سے ، گلچین کا دنیا سے سفر

یہاں پہلے داغ کا ذکر تھا لیکن اب تمام عالم اس میں سمٹ کر آگیا اور ایک بلندی پیدا ہو گئی - یہ بلندی قدر کی بلندی ہے اور یہی حسن کی جان ہے -

احساس جمال درحقیقت روح کے ابھرنے اور ترقی کرنے کا نام ہے - روح کی حرکت کو سکون صرف ایسی بلند چیز میں ملتا ہے جو مجموعی طور پر ایسے ایک واحد کل کی حیثیت رکھتی ہو جس کے متعدد اجزاء آپس میں ہم آہنگی کے ساتھ مل جائیں - یہ وحدت و بلندی اس وقت حاصل ہوتی ہے جب تخیل رنگ ، آواز اور صورت کو موزوں طریقہ پر باہم دیگر روح کی نا آسودہ تمناؤں اور دل کے صدھا شوق نارسیدہ کے ساتھ اس طرح ملا دیتا ہے کہ ان میں باہم فرق مشکل معلوم ہوتا ہے اور ہر جز و کل میں اور کل جزو میں نا قابل امتیاز طریقہ پر مل جاتا ہے - یہ نئی دنیا وہی تخئیلی ہیولا ہے جہاں ہماری روح کی خواہشیں پوری ہوتی ہیں - اس تخلیقی قوت کو جب نقش و نگار ، موسیقی ، بت تراشی یا شعر میں منتقل کرتے ہیں تو اسے فن یا آرٹ کہا جاتا ہے - معلوم ہوا کہ حسن ہم صرف اپنی روحانی تسکین و آسودگی اور اندرونی اضطراب و التہاب کو کم کرنے کے لئے پیدا کرتے ہیں اور پھر خارجی اشیاء کو اس سے متصف کرتے ہیں - یہی اضطراب تمنا و جوش شوق قدر کا ضامن اور حسن کی علت ہے - یعنی روح ہی حسن کا اصلی سبب ہے کیونکہ روح خارجی اشیاء کو جذب کرکے ان کو اپنی تمناؤں کے مطابق ایک نئی 'صورت' میں

منتقل کر دیتی ہے اور یہی 'صورت' جو خود ہمارا روحانی عکس ہے حسن کی صورت ہے -

مرزا نے کیا خوب کہا ہے :—

وہی ایک بات ہے جو یہاں نفس واں نکہت گل ہے
چمن کا جلوہ باعث ہے مری رنگیں نوائی کا

(۲)

حسن اور آرٹ

اب تک ہمارا موضوع بحث صرف حسن تھا جو ایک داخلی کیفیت کا نام ہے - اس کیفیت کے ماتحت تخیل انسان کو شادمانی اور مسرت کی دنیا میں پہونچا دیتا ہے - یہ روحانی عالم جمالیات کا نصب العین ہے - اور یہیں اس کی حد بھی ختم ہو جاتی ہے - اس جمال سے روح خاموش طور پر مسرور ہوتی ہے مگر یہ خاموش نغمہ تاروں سے نکلنے کی خواہش کرتا ہے اور تخیل کی طرف سے برابر اظہار کا تقاضا ہوتا رہتا ہے - جب تک اس اندرونی کیفیت کا خاطر خواہ اظہار نہیں ہو جاتا اس وقت تک دل کو سکون نہیں ملتا جب اس تخئیلی ہیولا کا اظہار شاعری ' بت تراشی ' موسیقی وغیرہ میں ہوتا ہے تو اسے فن یا آرٹ کہتے ہیں - جس طرح اس تخئیلی ہیولا میں خارجی شے اور تخیل دونوں کی خصوصیت نمایاں ہوتی ہے اسی طرح فن میں بھی بہ یک وقت تخیل اور خارجی شے کا اظہار ہوتا ہے - یہ تخئیلی ہیولا چونکہ خود روح کی تخلیقی صفت کا مظہر ہے اس لئے اس کا اظہار جب فن میں ہوتا ہے تو فن بھی تخلیقی ہوتا ہے -

ہم نے ابھی کہا ہے کہ جذبات اظہار کا تقاضا کرتے ہیں - مثلاً اگر آپ سمندر کے کنارے شام کے وقت غروب آفتاب کا منظر دیکھیں جب سمندر کی چھوٹی چھوٹی لہریں ہوا کے اشارے پر ساحل سے کھیل رہی ہوں

اور پاس کے درختوں پر چڑیاں بھی ہلکے ہلکے سروں میں گارهی هوں تو آپ کے دل میں بھی ایک نامعلوم خواهش اظہار پیدا هوگی - اگر آپ موسیقی سے دل چسپی لیتے هیں تو کچھ گنگنانے لگ جائیں گے - اگر شاعر هیں تو کچھ نہ کچھ کہنے لگ جائیں گے اور جب تک کہ آپ اس دل فریب منظر کو اپنی بساط کے مطابق اپنے رنگ میں رنگ نہ دیں اس وقت تک آپ کو چین نہ آئیگا - اس وقت آپ اپنی تخلیقی قوت کے زور سے جو هر انسان کو فطرت کی طرف سے کم و بیش عطا هوتی هے ایک حسین هیولا تیار کریں گے - اگر آپ میں صلاحیت زیادہ هے تو یہ هیولا بلند مضامین سے پر هوگا اور اس کے مختلف اجزا هم آهنگی کے ساتھ مل کر ایک واحد کل کی شکل اختیار کر لیں گے اور اس هیولا کی ایک ابتدا اور ایک انتہا هوگی جو آپ کے جذبات کے زیر و بم کو ظاهر کریگی - اس تخئیلی هیولا کا اظہار جب صورت کے ذریعہ هوگا تو اس کا نام فن یا آرٹ هوگا -

مگر جذبات اظہار کا کیوں تقاضا کرتے هیں اور دل میں کیوں هیجانی کیفیت برپا هوتی هے ؟ اس هیجانی کیفیت کی کئی وجہیں بتائی جاتی هیں - بعض لوگوں کے نزدیک اس کی وجہہ الہام

۱ — الہام

هے یعنی صاحب فن پر ایک خاص قسم کی کیفیت طاری هوتی هے جس کے ماتحت وہ گلکاریاں کرتا هے - اس لحاظ سے فن نام هے کسی مضمون یا کسی کیفیت کی وضاحت کا یا کسی داستان کی شرح کا - مثلاً شاعر اپنے قصۂ غم کی شرح کرتا هے یا بہار کے اثر کو بہاریہ مضامین باندھکر ظاهر کرتا هے یا اگر حب وطن سے سرشار هے تو اهل وطن کو پیام دیتا هے - اسی طرح استادان موسیقی کسی کیفیت سے متاثر هوکر کوئی خاص راگ گاتے اور

بنجاتے ھیں اور مصور مناظر فطرت کی نیرنگیوں کو آب و رنگ دیکر خطوط کی دنیا میں واضع کرتا ھے -

مگر الہام کے معنی ھیں در دل افگندن کے جس سے شاید مراد یہ ھےکہ صاحب فن پر کسی بالاتر ھستی کا باطنی طور پر اثر ھوتا ھے اور صاحب فن ویسے ھی نقش و نگار بناتا ھے جیسا اس ھستی کا ایماء ھوتا ھے - اکثر شعرا کو اسی لئے تلامذالرحمان بھی کہا گیا ھے کیونکہ بعضوں کا خیال ھے کہ خدا اور شاعر کے درمیان ایک سلسلہ قائم ھو جاتا ھے اور خدا براہ راست شاعر کے دل میں جو بات ڈالتا ھے وھی شاعر شعر کی صورت میں ادا کرتا ھے - بہت سے بڑے بڑے شعرا اور صاحبان فن نے اس باطنی اثر کو محسوس کیا ھے اور اس کا اظہار بھی کیا ھے - مثلاً

دوش وقت سحر از غصہ نجاتم دادند
وندراں ظلمت شب آب حیاتم دادند
چہ مبارک سحرے بود و چہ فرخندہ شبے
آں شب قدر کہ ایں تازہ براتم دادند

دوش بر سوز دل و سینہ براتم دادند
سر چو شمع ببریدند و حیاتم دادند

مژدۂ صبح دریں تیرہ شبانم دادند
شمع کشتند و ز خورشید نشانم دادند

درون سینۂ ما سوز آرزو ز کجاست ؟
سبو ز ماست ولے بادہ در سبو ز کجاست ؟

نگاہ ما بگـر یہان کہکشـاں افتـد
جنون ما ز کجا شورہائے و ھو ز کجاست۔؟
جز نالہ نمی دانم گـویند غزل خوانم
این چیست کہ چون شبنم بر سینۂ من ریزی ؟

ھم کو اس کا عام طور پر قطعی علم نہیں کہ وہ باطنی اثر کیوں طاری ھوتا ھے اور کب طاري ھوتا ھے - یہ ھمارے اختیار سے باھر ھے مگر اس کے باوجود جن پر طاري ھوتا ھے وہ اس کی حقیقت سمجھتے ھیں اور اس وقت ان کو ایسا معلوم ھوتا ھے کہ وہ کسی دوسری دنیا میں محسوسات سے بلند ھے -

لیکن الہام ایک اور معنی میں بھی استعمال ھوتا ھے - مثلاً آپ کسی اچھے شاعر کا کوئی اچھا شعر سنتے ھیں تو اکثر بول اُٹھتے ھیں کہ صاحب یہ شعر نہیں الہام ھے یعني فلاں مضمون کو اس بلند طریقہ سے ادا کیا گیا ھے جو بہت مشکل تھا اور شاعر اپنے تیز احساس کی بدولت اس بلندی پر پہونچ گیا جہاں آپ کا خیال نہ جا سکا تھا اور جب آپ اس شعر کی مدد سے وھاں پہونچے تو بے اختیار آپ کی زبان سے تحسین و آفرین کے کلمات نکل آئے - لیکن شاعر شعر کہنے کے قبل کسی چیز سے ضرور متاثر ھوا ھوگا یعنی جو مضمون اس نے باندھا ھے اس کا کچھ حصہ اس نے مشاھدہ کیا ھوگا اور یہی مشاھدہ اس ھیجان کی وجہ ھوگا جس میں بعد کو تخیل نے اور قدور شامل کر دئے ھوں گے -

حالی نے مسدس اور اقبال نے شکوہ لکھا اور دونوں مسلمانوں کی پستی سے متاثر ھوئے - دونوں نے اپنے اس تاثر کا اظہار اپنی اپنی نظموں میں کیا ھے - شکوہ اور مسدس بے شک دونوں بہت بلند نظمیں ھیں مگر کیا ان کا سرا الہام میں ملتا ھے ؟ سچ پوچھئے تو شاعر ھر چیز سے متاثر ھوسکتا ھے - اس کی گذشتہ زندگی ھر وقت اس پر اثر ڈالنے کے

لئے تیاری رہتی ہے - پھر دنیا کی ساری تاریخ اس کے دماغ کے خزانہ میں بند رہتی اور وہ بقدر ضرورت اس سے فائدہ اُٹھا سکتا ہے اور کسی واقعہ کے ذرا سے اشارہ پر اس تاریخ کا خزانہ کھل جانے کو تیار رہتا ہے - شاعر تو بقول مرزا غالب باجے کی طرح شکووں سے پر ہوتا ہے - اس کو تو بس چھیڑنے کی ضرورت ہے - اب خواہ یہ چھیڑ اس کو کسی واقعہ سے ہو یا کسی منظر سے - اس کے لئے تو اشیاء میں ایک نشتر کا اثر پنہاں ہوتا ہے جو دل کی رگوں سے برابر خون کا تقاضا کرتا ہے اور جب تک شاعر خون کے آنسو رو نہیں لیتا اس کو تسکین نہیں ہوتی - جب ضرورت ہوتی ہے وہ یہ نشتر خود تلاش کر لیتا ہے - حالی کو یہ نشتر مسلمانوں کی موجودہ پستی میں ملتا ہے مگر اقبال کو یہی نشتر کہیں بلقان کی لڑائی میں ' کہیں صقلیہ کے جزیرہ میں ' کہیں شام کی خاموشی میں اور کہیں لالہ صحرا کے داغ میں ملتا ہے اور یہیں سے وہ ہیجان اٹھتا ہے جو شعر کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے - اس کو غلطی سے لوگ الہام کہتے ہیں حالانکہ یہ سارا آتش گیر مادہ مدتوں سے شاعر کی روح کے خاموش گوشوں میں پرورش پا رہا تھا جس کو حوادث کی ایک چنگاری نے نذر آتش کردیا - اسی طرح شادی و غم ' بہار و خزاں ' زندگی و موت یا کسی اور واقعہ سے دل پر چوٹ لگتی ہے تو اضطرابی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے اور دل پگھل جاتا ہے - صاحب فن اس پگھلے ہوئے مادہ سے تخلیق کا کام لیتا ہے - اگر وہ شاعر ہے تو شعر کہنے لگتا ہے - مصور ہے تو تصویر بناتا ہے اور موسیقی سے دلچسپی رکھتا ہے تو راگ اور راگنیاں نکالتا ہے - کہا جاتا ہے کہ تخلیق اس وقت عمل میں آتی ہے جب صاحب فن کے جذبات برانگیختہ ہوجاتے ہیں مگر سچ پوچھئے تو جذبات کا نام غلط ہے - انہیں تو رجحانات یا خواہشات کہنا چاہئے - صاحب فن کچھ تمنائیں رکھتا ہے کچھ

آرزؤں سے نامعلوم طریقہ پر اس کا دل گداز رہتا ہے اور یہ آرزوئیں اور تمنائیں اس وقت پوری ہوتی ہیں جب ان کا اظہار مناسب ذرائع سے اس طرح ہو کہ جب ان کا تصور کیا جائے تو دل کو تسکین ہو - مثلاً ایک شاعر کو ایک حسین چہرہ یا ایک خوبصورت پھول دیکھنے کے بعد اس وقت قرار آئے گا جب وہ شعر میں اپنی اس کیفیت کا ذکر کر لے گا بعد ازاں اس شعر کے تصور میں اس کو مسرت حاصل ہوگی - غالب کا ایک شعر اس کیفیت کا کتنا آئینہ دار ہے -

بتاؤ اس مژہ کو دیکھکر کہ مجھکو قرار
یہ نیش ہو رگ جاں میں فرو تو کیوں کر ہو

اسی طرح ایک مصور کو تصویر بنانے اور ایک موسیقی داں کو راگ نکالنے کے بعد سکون حاصل ہوگا - شے ایک ہی ہے مگر اس نے لوگوں کو تین طرح پر متاثر کیا - اس کی وجہ یہی ہوسکتی ہے کہ ان تینوں صاحبان فن کی فطرت مختلف ہے اور مختلف ذرائع اظہار چاہتی ہے - صاحب فن اپنے تمام رجحانات ماں کے پیٹ سے لیکر آتا ہے اور اپنی ساری زندگی ان رجحانات کی پرورش اور نشو و نما میں ختم کر دیتا ہے - وہ اپنے رجحانات کو بدل نہیں سکتا - اگر زمانہ نے نامساعدت کی تو وہ چیز دب جائیگی مگر بدلے گی نہیں - اساڈورا ڈنکن (Isadora Duncan) جو امریکہ کی ایک نہایت مشہور رقاصہ گذری ہے اپنے سوانح حیات میں لکھتی ہے کہ " میری پیدائش سے قبل میری ماں سخت روحانی اور جسمانی اذیت میں مبتلا تھی - وہ جھینگے مچھلی میں برف ڈال کر کھاتی اور شراب میں برف ڈال کر پیتی تھی اگر لوگ مجھ سے پوچھیں کہ میں نے کب سے رقص کرنا شروع کیا تو میں کہوں گی کہ ماں کے پیٹ

سے اور شاید یہ اس غذا کا اثر ہو جو میری ماں کھاتی تھی کیونکہ عشق و محبت کی دیوی افروڈیٹے (Aphrodite) کی بھی یہی غذا بتائی جاتی ہے - میری ماں اس زمانہ میں سخت تکلیف میں گرفتار تھی اور اکثر کہا کرتی تھی کہ جو بچہ پیدا ہوگا وہ یقیناً عام بچوں سے مختلف ہوگا اور یہ حقیقت ہے کہ جس دم سے میں پیدا ہوئی میں اپنے پانوں اور بازوؤں کو اسی طرح حرکت دینے لگی کہ میری ماں یہ دیکھ کر چیخ اٹھی اور کہنے لگی کہ دیکھو میں نہ کہتی تھی کہ یہ بچہ دیوانہ ہوگا - تھوڑے دنوں بعد میری یہ حالت ہوگئی کہ کوئی بھی گت ہو میں اس پر رقص کرتی - یہ دیکھ کر میرے گھر کے لوگ دلچسپی کا اظہار کرنے لگے...... شروع ہی سے میں اپنی روح کے اشارہ پر رقص کرتی تھی - بچپن میں بالیدگی کے احساس سے رقص کرتی تھی - شباب کی منزل میں آئی تو ان نشتروں کی خلش سے متاثر ہوکر رقص کرتی تھی جن کا اثر دل کی گہرائیوں میں محسوس ہوتا ہے - یہ زندگی کے وہ تاثرات تھے جو تمام تمناؤں کا نہایت بیدردی کے ساتھ خون کرتے ہیں - بعد ازاں اس ظالم و بیدرد زندگی کے ساتھ مجھکو 'رقص کشاکش' بھی کرنا پڑا جس کو بعض لوگ 'موت' سے تعبیر کرتے ہیں " - لیکن ان فطری جذبات کو جلا دینے اور رنگ (perfection) تک پہنچانے کے لئے اساتذۂ فن کے مجوزہ قواعد و قوانین سے مطابقت پیدا کرنا بھی بڑا اہم امر ہے!

اس سے اتنا تو واضح ہوگیا ہوگا کہ فن کی صلاحیت فطری ہے مگر فن کی دنیا میں جذبات کے لئے ذریعہ نہایت اہم ہے - روح کے اظہار کے لئے اگر مناسب ذریعہ دستیاب ہوگیا تو روح و ذریعہ آپس میں اس طرح متحد ہوجاتے ہیں کہ ان میں باہم تمیز مشکل ہوتی ہے - اس وقت ذریعہ میں روح کی خصوصیات اور روح میں ذریعہ کی خصوصیات پیدا ہوجاتی ہیں - لیکن صاحب فن کے لئے ذریعہ تلاش کرنا آسان نہیں - اس کو پہلے یہ معلوم کرنا چاہئے کہ اس کی فطرت اس کو کس ذریعہ کی

طرف لیجاتی ہے - اگر شاعری سے لگاؤ ہے تو اس کو شعر کہنا چاہئے - اگر موسیقی یا مصوری سے فطری دلچسپی ہے تو اس کو اس شعبہ میں مہارت حاصل کرنی چاہئے اور اپنے رجحان کے مطابق محنت کرنی چاہئے تاکہ صاحب فن اور ذریعہ میں مکمل ہم‌آہنگی ہوجائے - صحیح ذریعہ اس لحاظ سے روح کو تقویت بخشتا ہے اور اس کی نشو و نما میں مدد کرتا ہے لیکن اگر ذریعہ کے انتخاب میں غلطی ہوئی اور شاعر نے مصوری شروع کردی تو خشت اول چون نہد معمار کج والا معاملہ ہوجائے گا شاعر کبھی رنگوں کی آمیزش اور سادگی کے پر پیچ مسئلہ کو نہ سمجھ سکیگا اور نہ یہ مرحلہ اس سے کبھی حل ہوگا - ذریعہ اصطلاح کا حکم رکھتا ہے اس لئے ایک اچھے شاعر کو زبان ' محاورہ اور عروض وغیرہ سے بالکل اسی طرح سے آگاہی ہونی چاہئے جس طرح ایک اچھے مصور کو مختلف رنگوں کی خاصیت اور ان کے تدریجی تغیر (shade) کا حال معلوم ہوتا ہے - میرا یہ مطلب نہیں کہ علم عروض اور صنائع بدائع سے مکمل طور پر واقف ہوئے بغیر کوئی شاعر نہیں ہوسکتا - ایسا اکثر ہوا ہے کہ بعض لوگ مصطلحات شاعری سے مکمل طور پر واقف نہ تھے مگر بہت بڑے شاعر ہوئے - مولانا روم کہتے ہیں :—

شعر می گویم بہ از قند و نبات * من ندانم فاعلاتن فاعلات

اسی طرح کتنے ایسے لوگ ہیں جو عروض و محاورہ وغیرہ پر کافی عبور رکھتے ہیں مگر شاعری کی نعمت سے محروم ہیں - ان مثالوں سے میری مراد یہ ہے کہ تخیل کے ساتھ فن شاعری سے آگاہی بھی ضروری ہے ورنہ شاعر بے تکا ہوجائے گا - خیال کیجئے کہ اگر حسن معنی کے ساتھ حسن الفاظ نہ ہو تو سامع پر شعر کتنا گراں گذریگا - ایک اچھا شاعر حسن

خیال کے لئے عمدہ الفاظ تلاش کرتا ہے اور دونوں کی باہمی ترکیب سے ایک پیکرِ حسن تیار کرتا ہے - لیکن ایک معمولی شاعر صرف الفاظ اور محاورہ کی بندش وغیرہ ہی کو اپنا منتہائے کمال سمجھتا ہے اور محاورات کے مانجنے اور قلعی کرنے میں یہاں تک لگا رہتا ہے کہ شاہدِ خیال اس کی آنکھوں سے روپوش ہوجاتا ہے - اس کا احساسِ جمال بس الفاظ کی دنیا تک محدود ہوجاتا ہے - یا ایک مصور کی مثال لیجئے جو مختلف رنگوں سے عروس خیال کو سنوارتا ہے اور زیبائش بخشتا ہے مگر ایک دوسرا شخص ہے جو صرف رنگ بناتا ہے - رنگ بنانے والے کے لئے خیال و معنی کی دنیا بہت دور ہے کیونکہ یہ تو مصور کا کام ہے جو رنگ اور معنی میں اتصال پیدا کرتا ہے - رنگ بنانے والا کا درجہ تو محض جزو کا ہے جس کو لوگ اکثر غلطی سے کل کا درجہ دیدیتے ہیں - شاعری میں ان لفظی رعایتوں پر زور دینے والوں کی حیثیت اسی رنگ ساز کی ہے جو رنگ تو بناتا ہے مگر رنگ کے معنی سے بے خبر ہے اور لوگ ناواقفیت سے اس کو شاعر سمجھتے ہیں - لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس جزو میں اس رنگ ساز کی حیثیت ایک چھوٹے کل کی بھی ہے کیونکہ وہ اپنے محدود دائرہ میں مختلف قسم کے رنگوں سے تجربہ کرتا ہے اور جو رنگ بہتر دیکھتا ہے ان کو تیار کرتا ہے - مگر ایک مصور کے یہاں جیسا کہ میں ابھی کہہ چکا ہوں اس چھوٹے کل کی حیثیت محض ایک جزو کی ہوتی ہے - اس جزو اور کل میں کوئی خاص امتیازی نشان قائم کرنا اس لحاظ سے ذرا مشکل معلوم ہوتا ہے کہ رنگ ساز کا جزو مصور کے کل میں جاکر مل جاتا ہے - اگر امتیاز ہوسکتا ہے تو بس اسی صورت سے کہ وہ جزو ہے - یہی حال رقص کا بھی ہے - یعنی ہاتھ اور پاؤں کی موزوں اور مناسب حرکت جہاں تک جذبات اور وجدانات کی ترجمانی

کرتی ہے وہ آرٹ ہے لیکن جب حرکت ہی کو ایک مستقل فن کی صورت دیدی جاتی ہے تو رقص کی اصلی روح افسردہ ہوجاتی ہے یہ بالکل ممکن ہے کہ جس طرح رنگ ساز کو رنگ بنانے اور معمولی شاعرکو الفاظ و محاورہ کے مانجھنے میں مسرت ہوتی ہے اسی طرح بعض رقص کرنے والے کو صرف ہاتھ، پانوں کی حرکت ہی میں لطف ملتا ہو - اس لحاظ سے اس نے جزوی طور پر تو ضرور جمال پیدا کرلیا مگر اس میں وہ عظمت و بزرگی نہ ہوگی جو اس رقص کرنے والے کا حصہ ہے جسکو کل کا احساس ہے -

ہم اوپر بتا چکے ہیں کہ بیشتر ایسا ہوا ہے کہ کتنے شعرا فنی اصطلاحات سے پورے طور پر واقف نہ تھے مگر اس کے باوجود بہت بڑے شاعر ہوئے - ایک سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ زبان ان کے شدت احساس کا ساتھ، نہیں دے سکی اور شاید اسی لئے آپ تقریباً تمام بڑے بڑے شعرا کے کلام میں زبان ' محاورہ اور عروض وغیرہ کا کہیں نہ کہیں سقم ضرور پائیں گے - مولانا روم کے شاعر اعظم ہونے میں کس کو کلام ہوسکتا ہے لیکن ان کے یہاں بھی اسقام ملتے ہیں - حافظ کے کلام سے مشرق اور مغرب کے بڑے بڑے شعرا نے استفادہ کیا اور یہ کہنے میں مجھے بالکل باک نہیں کہ یہی وہ تنہا شاعر ہے جس کے یہاں رفعت خیال کا ساتھ، الفاظ کی پرواز نے زیادہ سے زیادہ دیا ہے گو مکمل طور پر نہیں دیا مگر ان کے یہاں بھی باوجود لطافتوں کے کہیں کہیں خامیاں نظر آتی ہیں - مثلاً ایک مشہور غزل کا مطلع ہے -

صلاح کار کجا و من خراب کجا
ببین تفاوت رہ از کجاست تابہ کجا

یہاں خراب کا قافیہ تابہ باندھا گیا ھے - اس قسم کی اور بھی باتیں بتائی جاسکتی ھیں - غالب و میر بھی اس سے بری نہیں - غالب کے یہاں تو اسقام کی تعداد کافی ھے - مثلاً

دل اس کو پہلے ھی ناز و ادا سے دے بیٹھے
ھمیں دماغ کہاں حسن کے تقاضا کا

جگر تشنہ آزار تسلی نہ ھوا
جوئے خوں ھم نے بہائی بن ھر خار کے پاس

ان نامی شعرا کے اسقام کی طرف اشارہ کرنے سے میرا یہ مطلب ھرگز نہیں کہ میں ان کے اسقام کی تشہیر کروں بلکہ میرا مقصد اس اظہار سے صرف یہ بتانا ھے کہ ان شعرا کا احساسِ جمال اتنا شدید تھا کہ ان کے زمانہ کی زبان ان کے اظہار کے لئے ناکافی ثابت ھوئی - تقریباً ھر بڑے شاعر کے سامنے یہ مرحلہ آتا ھے اور اسی لئے آپ نے دیکھا ھوگا کہ وہ صرف اپنی تسکین کے لئے زمانہ سے الگ ایک راستہ نکال کر خود اپنی زبان وضع کرتا ھے ' اپنی ترکیبیں بناتا ھے تاکہ زیادہ سے زیادہ اپنی ترجمانی کرسکے - ابتدائے زمانہ ان ترکیبوں کو اکثر قبول کر لیتے ھیں اور اکثر غرابت کے باعث علیحدہ چھوڑ دیتے ھیں - لیکن کیا یہ ممکن نہیں کہ بڑے شعرا اپنے زمانہ کے محاورات کی چہار دیواری کے اندر رہ کر اپنے جذبات کو مکمل طور پر بیان کردیں - بے شک اگر وہ ایسا کرتے تو بہت اچھا ھوتا مگر یہ ناممکن ھے - شاعری کی تاریخ پر نظر ڈالنے سے معلوم ھوتا ھے کہ بڑا شاعر جدت پسند ھوتا ھے اپنی روح کے لئے علیحدہ فضا تیار کرتا ھے وہ عوام سے ملا ھوا بھی اور عوام سے بلند بھی ھوتا ھے - اس لئے جب وہ اپنی بلندی پر پرواز کرتا ھے تو زبان جو

عوام کے میل جول سے بلتي هے پیچھے رہ جاتی هے اور اس بلندی پر جو کچھ وہ کہتا هے اس سے اس کا مقصد محض اپنی روح کی ترجمانی کرنا هوتا هے - اس لحاظ سے وہ خامی خامی نہیں هوتی بلکه روح کا شوق آزادي هے جو نئی نئی منازل کے تجربوں کی شکل میں ظاهر هوتا هے - لیکن اس سے یہ نہ سمجھ لیجئے گا کہ هر وہ شخص جس کے کلام میں سقم هے بڑا شاعر هے - بڑے شاعر کا سمجھنا تو صرف اهل ذوق اور اهل معنی کا کام هے - لیکن یہاں یہ کہنے دیجئے کہ بڑا شاعر یا بڑا صاحب فن ذریعہ و اصطلاحات سے بالکل نابلد بھی نہیں هوتا - اگر ذریعہ سے ناواقف هے تو اس میں بےتکا پن آجائے گا - هاں اگر ذریعہ سے واقف هے اور ذریعہ میں ''خامی'' هے تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس کی ساری تخلیق بےمعنی هوجائیگی -

دوسری چیز جس سے روح میں هیجان پیدا هوتا هے وہ ایک جاوید زندگي کی خواهش هے - یعنی صاحب فن کے دل میں یہ خواهش چھپی هوتی هے کہ وہ غیر فانی انسان هوجائے اور اپنی اس خواهش کو پوری کرنے کے لئے وہ صورت گری کرتا هے اور یہ صورت اسکی تمناؤں اور رجحانات کا عکس هوتي هے - صاحب فن سمجھتا هے کہ یہ صورت وہ اپنے بعد چھوڑ جائیگا اور وہ دیرپا هوگی اور اس کے بعد لوگ اس صورت کو دیکھکر اسکو یاد کریں گے - دراصل اس صورت کے پردہ میں خود صاحب فن کی زندگی جاوید کی خواهش تکمیل پاتی هے -

۲ — تمنائے زندگی جاوید

خواجه حافظ فرماتے هیں :—

هرگز نمیرد آنکه دلش زنده شد به عشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

مرزا غالب فرماتے ھیں :—

تاز دیوانم کہ سر مست سخن خواھد شدن
ایں مے از قحط خریداری کہن خواھد شدن
کوکبم را در عدم اوج قبولی بودہ است
شہرت شعرم بگیتی بعد من خواھد شدن

شیکسپیر نے بارھا اپنی نظموں میں اس بات کا اظہار کیا ھے کہ دنیا کی تمام چیزیں مٹنے والی ھیں مگر اس کا کلام غیر فانی ھے -

مگر فن اسی وقت اس خواھش کا حامل سمجھا جائیگا جب صاحب فن کا احساس اتنا شدید ھو کہ صاحب فن مجبور ھوکر صورت گری مکمل طور پر کر لے - اگر شعر پورا نہ ھوا اور نقاشی یا مصوری ادھوری رہ گئی تو یہ خواھش پوری نہ سمجھی جائے گی کیونکہ جن خواھشات کو دیرپا بنانے کا خیال تھا ان کا پتہ اسی وقت چلتا ھے جب ان کی تشکیل مکمل طور پر ھوچکی ھو -

اس طرح صاحب فن میں ھیجان پیدا ھونے کا ایک تیسرا نظریہ بیان کیا جاتا ھے جس کو نقالی کہتے ھیں - یعنی صاحب فن جس چیز سے متاثر ھوتا ھے اس کی صرف نقل کرتا ھے یا اس کا چربہ اتارنا چاھتا ھے اور چربہ اتارنے کی یہ خواھش آرٹ میں ظاھر ھوتی ھے - لیکن اگر ذرا غور سے دیکھا جائے تو کسی چیز کا پورا پورا چربہ اتارنا نہ صرف مشکل ھے بلکہ محال ھے - کوئی شخص خواہ وہ کتنا ھی بڑا صاحب فن کیوں نہ ھو کسی چیز کی مکمل طور پر نقالی کر ھی نہیں سکتا - فرض کیجئے کہ آپ کو کسی شخص کی تصویر کھینچنا ھے تو آپ پہلے یہ دیکھیں گے کہ تصویر

۳—نقالی

کس رخ سے اچھی آسکتی ھے پھر جو رخ آپ کے سامنے ہوگا اسی کی تصویر آئیگی - اس لحاظ سے دوسرے رخ کی تصویر آھی نہیں سکتی - پھر جو رخ آپ کے سامنے ھے اس میں بھی آپ کو دیکھنا پڑیگا کہ کون سا حصہ تصویر میں نمایاں ہونے کے اور کون سا بالکل چھوڑ دینے کے قابل ھے - یعنی آپ کو اپنے ذاتی وجدان سے کام لینا پڑیگا اور رخ کے انتخاب میں آپ وھی حصہ سامنے رکھیں گے جس سے آپ کے احساس جمال کو تسکین ھو - اس طرح یہ واضح ہوگیا ہوگا کہ کسی چیز کی مکمل طور پر نقالی ناممکن ھے - صاحب فن کو قدم قدم پر اپنی قوت انتخاب یا قوت قدریہ سے کام لینا پڑیگا اور جو تصویر وہ تیار کریگا وہ بالکل نقل نہ ہوگی گو کہیں کہیں تصویر میں اصل کے بعض پہلو ضرور نمایاں ہوں گے - اس لحاظ سے نقالی آرٹ کا کوئی حقیقی اصول نہیں ھے بلکہ عمل کا ایک حصہ ھے - لیکن جیسا میں نے ابھی بتایا ھے مصوری میں نقل کا کچھ نہ کچھ اثر ضرور ہوتا ھے کیونکہ اگر آپ تصویر کی عمدہ نقل اتارتے ہیں تو آپ کو ایک گونہ خوشی ہوتی ھے کہ آپ میں صحت کے ساتھ کسی چیز کے اخذ کرنے اور ترتیب دینے کی صلاحیت موجود ھے - اکثر لوگوں کو نقل مطابق اصل اتارنے میں اس لئے بھی لطف آتا ہوگا کہ وہ چند سادہ دلوں یا سادہ لوحوں کو اپنی تفریح طبع کے لئے کچھ دیر فریب نظر میں گرفتار کر رکھیں - مثلاً کسی دیوار میں اگر دروازہ اس طرح رنگ کر بنایا گیا ہو کہ معمولی دیکھنے والا یہ سمجھکر کہ دروازہ ھے اس کو کھولنے کی کوشش کرے تو آپ اس کی سادہ دلی پر ہنس پڑیں گے اور خوش ہوں گے کہ کیا فریب دیا مگر یہ خوشی اس روحانی مسرت سے بالکل علیحدہ ھے جو تخئیلی ہیولا کو رنگ اور الفاظ کا جامہ پہناتے وقت ہوتی ھے - اگر کوئی مصور کسی قدرتی منظر سے متاثر

ہوا ہے اور اس نے اس منظر کی کوئی تصویر بنائی ہے تو آپ دیکھیں گے کہ اس تصویر میں اس نے اپنی قوت انتخاب سے کام لیکر تخیل کو بہت کچھ اس میں داخل کردیا ہے اور آپ اس تصویر کو دیکھ کر اس منظر کا خیال ضرور کریں گے کیونکہ وہ منظر اس تصویر میں ایک حد تک موجود بھی ہے اس لحاظ سے نقالی کا کچھ نہ کچھ اثر آرٹ پر ہوتا ہے مگر یہ آرٹ کا کوئی مرکزی اصول نہیں ہے -

۴ — اظہار جذبات

چوتھا نظریہ جس کو اکثر اصحاب ضروری خیال کرتے ہیں اور جس سے دل پگھلتا ہے وہ صاحب فن کا اپنا درد دل دوسروں پر ظاہر کرنے کا جذبہ ہے - یعنی جو شعلہ صاحب فن کے دل میں بھڑک رہا ہے اگر وہ کسی طرح دوسروں کے دل میں بھی بھڑک اُٹھے تو یقیناً لوگوں کو اس سے ہمدردی ہوجائیگی اور پھر بمصداق "مرگ انبوہ جشنے دارد" اس کے دل میں بھی وہ اگلی سی بیقراری اور تکلیف نہ رہیگی - بعضوں نے کہا ہے کہ آرٹ صرف جذبات کا اظہار ہے - کسی کا ان سے مطلع ہونا ضروری نہیں - لیکن اگر کوئی مطلع ہوگیا ہو تو کوئی مضائقہ بھی نہیں - اس کی مخالفت میں پروفیسر ابر کرامبی کا قول ہے کہ صاحب فن کے جذبات سے دوسروں کے آگاہ ہونے کا نام ہی آرٹ ہے اور جب ہم کسی آرٹ کے نمونہ کو دیکھتے ہیں تو ہم تک صاحب فن کا احساس منتقل ہوتا ہے - اگر ہم صاحب فن کے احساس میں اس آرٹ کے ذریعہ شریک نہ ہوں تو صاحب فن کا مقصد پورا نہ ہوگا - ہم صاحب فن کے احساس کو اُس کے آرٹ کے ذریعہ سمجھتے ہیں اور اس کی خواہش کو جو تماشائیوں کی طالب ہے پورا کرتے ہیں - ہمارے تماشائی بننے سے صاحب فن کا کمال اور ترقی کرتا ہے - " اگر احساس جمال آرٹ کی تحریک کا باعث ہے تو اس

تحریک کا مغز وہ اظہار ہے جو صاحب فن دوسروں کی آگاہی کے لئے کرتا ہے " - مان لیجئے کہ ایک شخص غروب آفتاب یا شب ماہ کا لطف اٹھاتا ہے تو وہ کوئی آرٹ نہیں تیار کرتا - ہاں جب وہ اس لطف کو دوسروں پر ظاہر کرکے ان کو شرکت کی دعوت دیتا ہے تو وہ گویا آرٹ تیار کرتا ہے - اس لحاظ سے آرٹ کسی انفرادی جذبہ کا نام نہیں بلکہ وہ ذریعہ ہے جس سے دوسروں کو صاحب فن کے احساسات کے سمجھنے کی دعوت دیجاتی ہے - جب تک صاحب فن دوسروں کو اپنے جذبات سے آگاہ نہیں کرلیتا اس وقت تک وہ صاحب فن نہیں ہوتا - جس طرح لوگوں کو خوشی و انبساط کے لمحوں کو طول دینے کے لئے آرٹ کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح آرٹ کو بھی لوگوں کی ضرورت ہوتی ہے کہ لوگ اسکو دیکھیں - اگر آپ صاحب فن کے سامنے سے تماشائیوں کو یا آرٹ سے لطف اٹھانے والوں کو ہٹا لیں تو آپ گویا صاحب فن کے اصلی مقصد میں خلل انداز ہو رہے ہیں کیونکہ آپ اس کے سامنے سے اس چیز کو ہٹا رہے ہیں جو آرٹ کی تحریک کا باعث ہے -

آرٹ کا تقاضا ہے کہ صاحب فن کے احساس کا اظہار دوسروں پر ہو - دوسروں پر اظہار سے کیا مطلب ہے اور یہ اظہار ہو تو کیونکر ہو کیونکہ کسی شخص کے احساسات و جذبات سے پوری پوری آگاہی حاصل کرنا ناممکن ہے - یہ ایک کیفیت ہے جس کو وہی شخص محسوس کر سکتا ہے جس پر یہ طاری ہوتی ہے - دوسرے کو کیا معلوم کہ فلاں کے دل میں کیا ہے - یا فلاں پر کیا گذر رہی ہے - اس کیفیت کو نظیری یوں ادا کرتا ہے -

بذیر شاخ گل افعی گزیدہ بلبل را
نوا گراں نخوردہ گزند را چہ خبر

لیکن اس سے بھي انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ایک شخص دوسرے شخص کی، اندرونی کیفیت کسي حد تک بذریعہ تمثیل و ہمدردی سمجھ سکتا ھے یعنی اگر کسی کو چوٹ لگی ھو تو دوسرا شخص وہ درد تو محسوس نہیں کرسکتا مگر یہ سوچے گا کہ جب خود اس کو چوٹ لگی تھی تو کیا ھوا تھا اور اپنی اسی تکلیف کا خیال کرکے اس کے ساتھ ھمدردی کریگا اور اسي معنی میں ایک شخص دوسرے کي اندروني کیفیت سمجھ سکتا ھے - صاحب فن جب آرٹ تیار کرتا ھے تو ھمکو موقع دیتا ھے کہ ھم اس کو دیکھکر اپنے اندر بھی ویساھي احساس پیدا کریں جیسا صاحب فن کے دل میں پیدا ھوا تھا - اس طرح وہ اپني کیفیت دوسروں پر ظاھر کرتا ھے - اگر اس کا اظہار شعر میں یا تصویر میں ھوا ھے تو ھم وہ شعر سن کر یا تصویر دیکھکر اپنے دل کے اندر ویساھی احساس پیدا کرسکتے ھیں جیسا شاعر یا مصور کے دل میں پیدا ھوا تھا - صاحب فن اپنا پورا احساس آرٹ میں منتقل کرتا ھے اور ھم آرٹ دیکھکر وہ احساس پیدا کرسکتے ھیں -

مندرجہ بالا بیان پروفیسر ابرکرامبی کے قول کا خلاصہ ھے - مگر ایک سوال ھوتا ھے کہ کیا صاحب فن کے لئے دوسروں پر اظہار کا جذبہ اشد ضروری ھے - کیا اسکے بغیر ایک صاحب فن صاحب فن نہیں ھوسکتا ؟ یہ ھملے مانا کہ صاحبان فن دیگر انسانوں کی طرح مدنیت کے طالب اور اجتماعی زندگی کے دلدادہ ھوتے ھیں اور اپنی روزمرہ زندگی میں بالکل دوسرے انسانوں کي طرح ھوتے ھیں مگر ان کی طبیعتیں بڑی نازک ھوتی ھیں - ان کو آرٹ کی تخلیق کے وقت شاید ھي اس کا خیال ھوتا ھو کہ زمانہ ان کے فن کو کس نظر سے دیکھیگا - وہ جس وقت شعر کہتے یا مصوري کرتے ھیں تو ان کو خیال صرف اپنا ھوتا ھے - یعنی وہ یہ دیکھتے ھیں کہ

انھوں نے اپنے جذبات کی کس حد تک کامیابی کے ساتھ ترجمانی کی ھے - وہ تو اپنی روح کے لئے ایک فضا تیار کرتے ھیں اور اسی میں پرواز کرتے ھیں - ان کو اس سے کیا مطلب کہ لوگ ان کے آرٹ کی تعریف میں رطب اللسان ھیں یا اس سے نفرت کا اظہار کرتے ھیں - مرزا نے کہا ھے :—

نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پروا
گر نہیں ھیں میرے اشعار میں معنی نہ سہی

اکثر دیکھا گیا ھے کہ بعض شعرا نے اپنا دیوان نذر آتش کردیا - گوئٹے نے جب فاؤست کی دوسری جلد مکمل کرلی تو اسے سربمہر کر کے صندوق میں بند کر دیا اور ھدایت کردی کہ اس کے مرنے کے قبل اس کو شائع نہ کیا جائے - کہا جاتا ھے کہ غالب نے اپنا ایک دیوان جمنا میں بہا دیا - اگر دوسروں پر اظہار کی خواھش ھوتی تو مندرجہ بالا واقعات کیوں رونما ھوتے - اصولاً یہ بالکل ممکن ھے کہ ایک شخص جنگل میں انسانوں کی مجلس سے دور آرٹ کا عمدہ نمونہ تیار کرے اور جہاں تک اس کی ذات کا تعلق ھے یہ نمونہ بالکل مکمل ھوگا لیکن اس میں صورت و معنی کی بہت سی خامیاں ھوں گی جو محض ایک اجتماعی نظام کے ماتحت دور ھوسکتی ھیں کیونکہ اجتماعی نظام کے ماتحت صاحب فن صورت و معنی کی بہت سی باریکیاں سمجھنے لگتا ھے اور پھر ان کو اپنے تخیل کی آمیزش کے بعد آرٹ میں منتقل کرتا ھے - مگر یہ بھی صحیح ھے کہ اگر صاحب فن ایک طرف دنیا والوں سے بےنیاز ھوکر کلبۂ عزلت میں اپنی مسرت کے لئے پیکر تراشی کرتا ھے تو دوسری طرف اس کے دل میں یہ خواھش بھی ھوتی ھے کہ کوئی نہ کوئی اس کی ھستی کو سمجھے مگر یہ خواھش اس کے فن کا کوئی مرکزی ستون نہیں جس سے آرٹ رونما ھوتا ھے بلکہ یہ ایک جزوی خواھش

ہے جو صاحبان فن میں اکثر پائی گئی ہے - ہاں البتہ تھیٹر میں سوانگ بھرنے کا جو فن ہے اس کے لئے یہ از بس ضروری ہے کہ لوگ اسے دیکھیں کیونکہ اس کا مقصد بغیر مجمع کے پورا ہو ہی نہیں سکتا -

۵—رغبت جنسي

جس طرح ایک زمانہ میں مشرق میں کوکا پنڈت کا زور تھا اسي طرح آج کل مغرب میں کوکا پنڈتوں کا زور ہے مگر مغرب کے کوکا پنڈت کچھ مختلف ہیں - سائنس کی عینک چڑھائے اور تحقیقات کا قلم ہاتھ میں لئے جو چاہتے ہیں لکھ جاتے ہیں - اس گروہ کے سر تاج ویانا کے مشہور ڈاکٹر سگمنڈ فریوڈ ہیں - ان کا قول ہے کہ انسان خواہشات کا بندہ ہے اور جو چیز اس کی خواہشات پر حکمرانی کرتی ہے وہ رغبت جنسی ہے - شاعری ' مصوری ' موسیقی ' فلسفہ ' ادب غرض زندگی کے ہر شعبہ میں اسی کا ظہور ہے - اگر یہ نہ ہو تو شمع زندگی بالکل مردہ ہوجائے - ان کے بعض پیرووں نے ان سے شدید اختلاف کیا ہے مگر ڈاکٹر فریوڈ کی روح آج تمام مغربی دنیا میں سرایت کئے ہوئے ہے -

اس مذہب کے مطابق آرٹ کا محرک شہوانی جذبہ ہے - مثلاً شاعری میں عشق و محبت ' ہجر و وصل کے خیالات کا اظہار ہوتا ہے کبھی ہجر کی شکایت ہے تو کبھي وصل کی خوشي - کبھي لب و دنداں کا ذکر ہے تو کبھی رخسار و چشم کی تعریف - غرض شاعر کبھی معشوق کا سراپا بیان کرکے کبھی ' معاملہ بندی ' کے بہانہ سے اپنے شہوانی جذبہ کو تسکین دیتا ہے - مصور بھي اسی طرح معشوق کی تصریر مختلف طریقوں سے بناتا ہے - مغنّی اسی کو نغمہ میں اور رقاص اپنے رقص میں ادا کرتا ہے - لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو رغبت جنسی ایک فطری یا جبلی خواہش ہے - جس طرح بھوک لگتی ہے ' پیاس کا غلبہ ہوتا

ہے اور نیند کی ضرورت محسوس ہوتی ہے اسی طرح نظام جسمانی کو عضویاتی سکون کی ضرورت ہوتی ہے - ہم بتا چکے ہیں کہ جمال درحقیقت روح کا فیض ہے اور جب اس جمال کو رنگ ' لفظ یا آواز کے ذریعہ ظاہر کرتے ہیں تو وہ آرٹ ہوتا ہے - رغبت جنسی میں روحانی جزو کم ہوتا ہے - کم میں نے اس لئے کہا کہ جسم کو کسی طرح روح سے الگ نہیں کرسکتے - ہر وہ چیز جس کا جسم سے تعلق ہے اس میں روح کا کچھ نہ کچھ ضرور اثر پایا جاتا ہے - اس لحاظ سے ممکن ہے کہ آرٹ کی تخلیق میں ابتدائی طور پر رغبت جنسی کا کچھ اثر ہو لیکن جب آرٹ اپنے کمال کی طرف بڑھتا ہے اور بلندی کی طرف پرواز کرتا ہے تو اس وقت رغبت جنسی سے اس کو دور کا بھی واسطہ نہیں رہ جاتا - اس مقام پر نہ ہجر و وصال کی وہ اگلی سی کیفیتیں باقی رہتی ہیں اور نہ معشوق کے سراپا کا خیال ہوتا ہے - یہاں تو صاحب فن آپ اپنا تماشا دیکھتا ہے - عارف شیراز نے کہا ہے -

لطیفہ ایست نہانی کہ عشق از و خیزد
کہ نام آں نہ لبِ لعل و خط زنگاریست

۲—غیر شعوری جذبہ

بعضوں کا خیال ہے کہ آرٹ کا محرک ہمارا غیر شعوری جذبہ ہے - اس کے متعلق ہمارا علم ابھی بہت کم ہے لیکن اس میدان میں تحقیقات کا قدم بہت تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے - جو چیز آج غیر شعوری نظر آ رہی ہے ممکن ہے کل اس حد تک وہ غیر شعوری نہ رہے - اس لئے اس پر یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جاسکتا لیکن یہ جذبہ ' ناآسودہ خواہشات اور نا رسا مطالبات کا ایک سمندر بے پایاں ہے جو برابر موجیں مارتا رہتا ہے - اس میں عقلیت کا جزو بالکل نہیں ہوتا - اس کو اگر یوں ہی چھوڑ دیا جائے

تو نظام معاشرت درہم برہم ہوجائے - اس کی تند اور تیز موجوں کو روکنے کے لئے شعور نے بند باندھ رکھے ہیں - ماہرین نفسیات کا بیان ہے کہ شعور کا عمل غیر شعوری جذبہ پر تین طرح سے ہوتا ہے -

(الف) شعور انسان کی سفلی خواہشات پر جو معاشرہ کے خلاف ہیں زبردست لگام لگاتا ہے اور ایسی کوئی چیز پیش آنے نہیں دیتا جس سے نظام معاشرت میں کسی خرابی کا امکان معلوم ہوتا ہو -

(ب) دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اس جذبہ کو ایک ایسے راستہ پر لگا دیا جائے جس سے اس کی خرابیاں دور ہوجائیں مثلاً غیر ملکیوں کے خلاف نفرت کا جذبہ جو اکثر ملکوں میں کار فرما ہے اس کا رخ بدل دیتے ہیں اور اس کو ملک کی ترقی و اصلاح کی طرف لگاتے ہیں -

(س) تیسرا طریقہ یہ ہے کہ سفلی کو بلند کر کے علوی کے درجہ پر پہونچا دیا جائے -

مگر اس کے باوجود اس کا اثر نمایاں ہوتا ہے کیونکہ اس میں طوفان کا سا جوش اور بجلی کا سا اضطراب ہوتا ہے - یہ گویا زندگی کا پوشیدہ خزانہ ہے - یقین یہیں پختہ ہوتا ہے - عمل کی بنیاد اسی جگہ استوار ہوتی ہے - جذبات یہیں سے ابھرتے ہیں - غرض یہ ہماری سیرت کا منبع ہے - لیکن ایک عجیب بات یہ ہے کہ باوجود سفلی آمیزش کے اس کی گہرائی میں حقیقت کی تلاش و جستجو کی خواہش بھی چھپی ہوتی ہے جو کائنات کی راز دار بننا چاہتی ہے - جرمنی کا مشہور فلسفی شاعر گوئٹے اپنے مشہور ناول ' نوجوان ورتھر کی داستان غم ' میں لکھتا ہے -

'' جب میں ان مناظر قدرت کو دیکھتا ہوں تو میرے قلب میں ایک جوش کی کیفیت اور ایک نور کی چمک پیدا ہوتی ہے جس سے اس

کائنات کا ذرہ ذرہ منور ہے - ان جذبات کی روانی سے میں اپنے کو ایک ایسی بلند سطح پر پاتا ہوں جہاں سے خدا کی شان کبریائی اور اس ناپیدا کنار عالم کی خوشنمائی اور بوقلمونی کا تماشا میری روحانی آنکھوں کو صاف نظر آتا ہے۔ اُس وقت بڑے بڑے پہاڑوں کی فلک بوس چوٹیاں میرے گرد احاطہ کرتی ہیں ' بڑے بڑے غار میرے قدموں کے لئے راستہ بناتے اور پرشور آبشار میرے سامنے سر کے بل غلطاں اور پیچاں نظر آتے ہیں - موجیں مارنے والے بڑے بڑے دریا میدانوں میں بہتے ہیں اور ان کے شور سے دشت و جبل گونج اٹھتے ہیں اور سطح زمین پر آسمان کے نیچے جانداروں کی لاکھوں کروڑوں قسمیں حرکت کرتی ہیں ' گویا میرے چاروں طرف ہر چیز بے شمار صورتوں کے ساتھ زندہ نظر آتی ہے - مگر افسوس آدمی کتنا بیوقوف ہے کہ اپنی حفاظت کے خیال سے اپنے چھوٹے چھوٹے مکانوں میں گھس کر بیٹھتا ہے اور اپنی اس پناہ سے بزعم خود اس عالم بسیط پر حکومت کرتا ہے - اف ! اس کے تنگ خیال میں ہر چیز کتنی تنگ نظر آتی ہے - لیکن ناقابل گذر پہاڑوں سے لق و دق صحراوں سے جو اب تک انسانی قدم کے نقوش سے بالکل پاک ہیں اور سمندروں کے نا معلوم کناروں سے اس خداے لایزال کی تسبیح و تہلیل ہر وقت بلند ہوتی رہتی ہے...... چڑیوں کی پرواز دیکھ کر کتنی بار میرے دل میں خواہش پیدا ہوئی ہے کہ کاش میں اس بحر بیکراں کے کنارے اڑ کر پہونچ جاتا اور اس بارگاہ بے پایاں سے مجھے بھی نشاط زندگی کا ایک چھلکتا ہوا جام عطا ہوتا اور میری روح کی قوتیں گو محدود سہی مگر تھوڑی دیر ہی کے لئے اس خالق بے نیاز میں جاکر گم ہو جاتیں جو اپنی ذات سے ہر چیز کا مکمل کرنے والا ہے " -

یہ روح کا تقاضا ہے کہ انسان ایک ایسی مافوق الفطرت ہستی کی جستجو کرے جو اس کائنات کی ناظم ہے - یہ انسانی وجد ان کی طلب

وسعی کا ماحصل ہے کہ وہ اس عالم سے نقاب الٹ کر اصل حقیقت کا مشاہدہ کرے - جس وقت یہ کیفیت طاری ہوتی ہے اس وقت روح کو اپنی لامحدود وسعتوں کا اندازہ ہوتا ہے اور خود اس کی انفرادی ہستی اس اصل حقیقت میں جاکر گم ہوجاتی ہے - حالانکہ یہ روحانی تجربہ ایک واقعہ ہوتا ہے مگر اسکا خاطر خواہ اظہار ناممکن ہے - اکثر صاحبان حال نے بیاں کیا ہے کہ اس وجدانی کیفیت کا ایک لمحہ زندگی بھر کی محنتوں اور مشقتوں سے بہتر ہے - انسان اس وقت سب کچھ دیکھتا ہے مگر دکھا نہیں سکتا - خود سمجھتا ہے لیکن اوروں کو سمجھا نہیں سکتا - منطق کا کوئی اصول فلسفہ کا کوئی نکتہ اس راز کو حل نہیں کرسکتا اس لئے کہ حقیقت ایک بے صورت چیز ہے جو الفاظ اور رنگ میں اسیر نہیں کی جاسکتی سعدی کہتے ہیں کہ - آں را کہ خبر شد خبرش باز نیامد - یعنی اس منزل کا جس کو پتہ چلا پھر دنیا والوں کو اس شخص کا پتہ نہیں چلتا - اس کیفیت کا مکمل اظہار کسی طرح بھی آرٹ میں ممکن نہیں - تمام ذرائع ناکام رہ جاتے ہیں کیونکہ اس نغمۂ سرمدی کو ' نازک سے نازک تار بھی برداشت نہیں کر سکتے - غالب نے کیا خوب کہا ہے :—

نے گل نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز

میں ہوں اپنی شکست کی آواز

یعنی جب انسان پر اس حقیقت کبریٰ کا جلوہ پڑتا ہے تو اس وجدانی کیفیت کا اظہار ناممکن ہوتا ہے - گویا اصل حقیقت اسی وقت منکشف ہوتی ہے جب تار ہستی شکست ہو جاتا ہے - مرزا نے اسی کو ایک جگہ فارسی میں بھی ادا کیا ہے :—

دیگر ز ساز بے خودی ما صدا مجوئے

آوازے از شکستن تار خود یم ما

زبان بندی کے اس دستور کے باوجود انسان سے بالکل خاموش بھی نہیں رہا جاتا - زبان بات کرنے کو برابر ترستی ھے - ایک کاوش اندر سے اظہار کا تقاضا کرتی رھتی ھے - گو اس کیفیت کا مکمل اظہار، ناممکن ھے مگر تھوڑا بہت اظہار اشارہ کے طور پر ضرور ھوتا ھے - اس طرح اس کیفیت کے ماتحت جو آرٹ ظہور پذیر ھوتا ھے وہ اشاریہ ھوتا ھے یعنی وہ حقیقت کا مکمل ترجمان تو نہیں ھوتا بلکہ حقیقت کی طرف صرف اشارہ کرتا ھے - مثلاً اگر کوئی مصور ایک شمع بنائے اور یہ دکھائے کہ اس کے پر تو سے ساری فضا روشن ھوگئی تو اس سے یہ مطلب نہ ھوگا کہ واقعی کوئی شمع ایسی ھے جس سے سارا عالم روشن ھوسکتا ھے بلکہ اس سے مراد یہ ھوگی کہ اگر آپ کے دل کی شمع روشن ھوجائے تو آپ اس کی روشنی میں سارے عالم کو دیکھ سکتے ھیں - شمع سے مراد یہاں آپ کا دل ھے اس مثال کے باوجود شمع اصل حقیقت کو ظاھر نہیں کرتی بلکہ صرف ایک مثال دیتی ھے یا اصل حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ھے - یہی وہ بلند مقام ھے جس کے ماتحت بڑے بڑے آرٹ کی تخلیق ھوئی ھے - چنانچہ شاعری ، مصوری ، ڈرامہ ، نقاشی ، بت تراشی کی ابتدا یہیں سے ھوئی اور بہتیرے باکمال صاحبانِ فن اسی جذبہ سے متاثر تھے - اگر مغربی نقادوں کے نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو اس منزل میں آرٹ کا قدم ڈگمگا جاتا ھے کیونکہ وہ اندرونی کیفیت کا مکمل طور پر یہاں اظہار نہیں کرتا اور مغربی نقادوں کے نزدیک اعلیٰ آرٹ وھی ھے جو اندرونی کیفیت کا مکمل طور پر اظہار کرے -

لیکن اس اشارہ کی کیا نوعیت ھوتی ھے ؟ یہ اشارہ ھمارے گرد و پیش کی چیزوں یا تاریخی روایات پر مبنی ھوتا ھے - ھم جو کچھ دیکھتے ھیں یا جن چیزوں سے ھم کو محبت ھوتی ھے ھم ان کو اشارہ کے طور پر استعمال

کرتے ھیں - مثنوی مولانا روم میں چرواھے اور حضرت موسیٰ کے قصہ میں چرواھے کی گفتگو اس کے اندرونی کیفیت کی طرف اشارہ کرتی ھے - چرواھا ایک بیخودی کے عالم میں کہہ رہا ھے کہ اے خدا اگر تو ملتا تو میں تیرے کنگھی کرتا ' تجھے بھیڑ کا دودھ پلاتا اور بھیڑ کے اون کا کپڑا پہناتا - تجھکو نرم نرم گھاس پر سلاتا - دیکھئے چرواھے کے سامنے اشارہ کے لئے وھی چیزیں آتی ھیں جن سے اس کو روز سابقہ پڑتا ھے اور جس سے اس کو محبت ھے - یہاں کنگھی ' دودھ اور بھیڑ کا اون یہ الفاظ صرف اشارہ کے طور پر استعمال ھوئے ھیں - لفظی معنی سے یہاں بالکل واسطہ نہیں -

ایک صحیح النظر نقاد کا کام ھے کہ وہ پیکر سے زیادہ معانی کی طرف غور کرے اور یہ دیکھنے کی کوشش کرے کہ جن کیفیتوں کے ماتحت یہ الفاظ ادا ھوئے ھیں وہ کیا ھیں اور الفاظ کا یہ پیکر تیار کرتے وقت صاحب فن کی روح کس کس طرح کی تمناؤں سے متاثر تھی اور کون کون سے رجحانات کام کر رھے تھے - اس لحاظ سے ضرورت ھے کہ نقاد میں ھمدردی کا جذبہ نہایت بلند ھو - اگر یہ نہ ھوا تو ممکن ھے کہ نقاد محاورہ کی کوئی غلطی ثابت کردے مگر اپنے اس جوش نکتہ چینی میں وہ یقیناً ایک بلند حقیقت سے نا آشنا رہ جائیگا اور اپنے فرائض کو صحیح طور پر انجام نہ دے سکیگا - نقاد نے اس منزل میں اگر صرف الفاظ سے معنی کا پتہ چلانے کی کوشش کی ھے تو وہ یقیناً راستہ بھٹک جائیگا ' پیکر کو وہ بے معنی کہدیگا اور اس کی سمجھ میں خاک نہ آئیگا کہ ایک چرواھا کس طرح خدا کو بھیڑ کا دودھ پلا سکتا ھے - اس کو کیا معلوم کہ چرواھے کے پہلو میں ایک بیقرار اور تڑپتا ھوا دل ھے جسکا اصلی اظہار ناممکن ھے اور جو کچھ ادا ھوا ھے وہ محض اشارہ کے طور پر ھے -

(۳)

ہم آہنگی و وحدت

جب صاحب فن کے دل میں احساس پیدا ہوتا ہے تو اس احساس کے مختلف ٹکڑے آپس میں ملکر معنی پیدا کرتے ہیں۔ ان میں ایک طرح کی ہم آہنگی ہوتی ہے اور تمام اجزاء متحد ہوکر ایک واحد کل کی شکل اختیار کرلیتے ہیں - یوں تو ہر چیز میں جہاں تک اس کی ذات کا تعلق ہے وحدت کی ایک شان پائی جاتی ہے - مثلاً درخت کی ایک پتی دوسری پتی سے بالکل الگ ہوتی ہے - نغمہ کی ایک تان دوسری سے مختلف ہے - پھول کی دلفریبی کچھ اور دریا کا لطف کچھ اور ہے - لیکن یہاں وحدت سے مراد وحدت فی الکثرت ہے - اس وحدت کی دو قسمیں ہیں - اول احساس کی وحدت - دوم آرٹ کی وحدت - احساس کی وحدت تو یہ ہوئی کہ احساس کے مختلف حصے اس طرح ہم آہنگ ہوں کہ وہ واحد ہو جائیں - فرض کیجئے آپ صبح کے وقت کسی پہاڑی پر کھڑے ہیں سامنے دور تک سمندر پھیلا ہوا ہے - اتنے میں سورج سامنے سے نکلتا ہوا نظر آتا ہے اور اس کی کرنوں کے اثر سے آسمان پر اُڑتے ہوے بادل کبھی سرخ اور کبھی نارنجی قبا اوڑھ لیتے ہیں - خوشگوار ہوا جب سطح آپ کو چھیڑتی ہے تو ہلکی لطیف موجیں اُٹھتی ہیں - ساتھ ہی پہاڑ سے ایک طرح کی خوشبو نکل رہی ہے جو ہر طرف پھیلی ہوئی ہے - آپ ان چیزوں کا لطف اٹھاتے ہیں - یہ تمام چیزیں آپ کے کان، آنکھ، ناک پر اول اول اپنا اثر ڈالتی ہیں لیکن جب یہ چیزیں آپکی روح کی گہرائی میں اترتی ہیں تو اس تمام منظر کا اثر کچھ اس طرح آپس میں مل جاتا ہے کہ آپ ایک چیز کے اثر کو دوسری چیز کے اثر سے الگ نہیں کرسکتے - ان میں ایک طرح کی ہم آہنگی پیدا ہوجاتی ہے اور

اس وقت یہ منظر نہ تو صرف سمندر ہوتا ہے ' نہ پہاڑ اور نہ آسمان بلکہ ان تمام چیزوں سے ملکر ایک مکمل منظر بنتا ہے جس میں وحدت کی شان پائی جاتی ہے - اس واحد منظر سے آپ کو لطف ملتا ہے کیونکہ آپکو اس میں قدر نظر آتی ہے - یہ احساس کی وحدت آپکی روح کا فیض ہے - جب تک وحدت کی یہ شان نہیں پیدا ہوتی اُس وقت تک احساس نامکمل اور مبہم ہوتا ہے - دوسری قسم آرٹ کی وحدت ہے یعنی احساس کی اس ہم آھنگی و وحدت کا اظہار آرٹ میں ہوتا ہے - آرٹ کا مقصد ہے کہ صورت کے ذریعہ معنی کا اظہار ہو - آرٹ جہاں تک جذبات کو متشکل کرتا جائیگا وھاں تک کامیاب سمجھا جائیگا - یہ آرٹ کا کمال ہے کہ احساس کو صورت کے طلسم میں اسیر کر دے - اس لحاظ سے جو وحدت احساس میں موجود ہے وہ آرٹ میں بھی ضرور نمایاں ہوگی - جس طرح احساس کے مختلف ٹکڑے آپس میں متحد ہوکر وحدت پیدا کرتے ہیں اسی طرح آرٹ میں ایک جزو کا دوسرے سے گہرا تعلق ہوتا ہے اور اجزا کے اس ربط و اتحاد سے ایک کُل بنتا ہے جسکی جھلک جزو میں صاف نمایاں ہوتی ہے - مغربی نقاد ان جمالیات اس امر پر زور دیتے ہیں کہ جب تک آرٹ مکمل طور پر جذبات کی صورت گری نہ کر لے اس وقت تک وہ نامکمل اور بدصورت رہتا ہے - ان کے اقوال کے مطابق آرٹ کا ایک حسین نمونہ تیار کرنے کے لئے گویا جذبات کی مکمل صورت گری ممکن ہے - اِس پر آیندہ صفحات میں بحث کی جائیگی -

آرٹ کی دنیا میں اس ہم آھنگی و وحدت کے حصول کے لئے چند طریقے اختیار کئے جاتے ہیں جنکو صورت گری کہتے ہیں - اس صورت گری میں ترتیب کا عنصر خاص طور پر نمایاں ہوتا ہے - فطرت انسانی کا یہ خاصہ ہے کہ صاحب فن آرٹ کی تخلیق کے وقت خود ایک طرح کا اندرونی ضبط اور ایک روک محسوس کرتا ہے اور یہی ضبط اس کے فن میں

ترتیب پیدا کرتا ھے اور مشق سے اس ترتیب پر جلا ھوتی ھے - یہ ضبط کوئی قاعدہ کے طور پر نہیں عائد کیا جاتا بلکہ یہ صحیح اظہار کا تقاضا ھے کہ جو چیز احساس کی ترجمانی کرے اس میں نظم ھو، ترتیب ھو تاکہ احساس وحدت کا صحیح صحیح اظہار ھوسکے - کسی صورت کے مختلف حصوں میں ھم آھنگی و ترتیب پیدا کرنے کے لئے مثلاً مصوری میں خطوط کا استعمال ھوتا ھے - ایک تصویر کے چاروں طرف خط کھینچ دینے سے یہ معلوم ھوتا ھے کہ یہ ایک تصویر ھے اور یہاں تک یہ علیحدہ اور مکمل ھوگئی - پھر تصویر کے اندر مختلف خطوط کی کشش سے مختلف حصے آپس میں ملا دئے جاتے ھیں - اگر سر اور جسم کا جوڑ دکھانا ھے تو ایک خط اس کے لئے کافی ھے - اسی طرح شاعری میں ھم آھنگی کے لئے علیحدہ اصطلاحات ھیں - مثلاً ردیف، قافیہ، محاورہ، الفاظ کا برمحل استعمال وغیرہ - جب کسی شعر میں یہ چیزیں صحیح طور پر استعمال کی جائینگی تو اس شعر میں ھم آھنگی پیدا ھوگی اور وہ شعر اپنی جگہہ مکمل ھوگا - پھر اس ترتیب کا نتیجہ ایک شکل میں ظاھر ھوتا ھے اور شکل کی مختلف قسمیں ھوگئی ھیں - مثلاً خط اور رنگ کی آمیزش و ترتیب سے مختلف قسم کی مصوری ھوسکتی ھے - ایک مصوری تو منظر کی ھوئی دوسرے چہرہ کی ھوئی جیسے ایران میں رائج تھی - تیسری قسم واقعات کی مصوری ھوئی جیسے قدیم ھندوستان میں رائج تھی - اور یورپ میں اب بھی رائج ھے - اسی طرح موسیقی میں مختلف راگ اور راگنیاں ھیں اور شاعری میں اوزان و بحور، قصیدہ، مسدس، مثنوی، رباعی اور غزل وغیرہ ترتیب کی مختلف قسمیں ھیں -

ایک باکمال صاحب فن کا فرض ھے کہ وہ اپنا تخلیقی عمل شروع کرنے سے قبل اپنے زمانہ تک کی اس صنف کی 'صورتوں' پر جس میں خود

وہ دلچسپی لیتا ہے ایک نظر ڈال جائے کیونکہ ان صورتوں کے مطالعہ سے جس میں اس صنف کے صاحبان فن نے اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے اسکی مشق میں ترقی ہوگی - اگر وہ شاعر ہے تو اس کو اپنے زمانہ تک کے شعرا کے کلام سے واقفیت ہونی چاہئے اور یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ اصناف شاعری میں سے کون سی ایسی صنف ہے جس میں وہ اپنے جذبات کا بہترین طور پر اظہار کرسکتا ہے - اگر اسکی طبیعت مثنوی کی طرف راغب ہے تو اسکو مثنوی کہنا چاہئے - غزل کی طرف لگاؤ ہے تو غزل اور نظم کی طرف مائل ہے تو نظم کہنا چاہئے - لیکن اگر کسی موجودہ ظرف میں اس کے جذبات کی شراب نہیں سما سکتی تو وہ لامحالہ کوئی دوسرا طرز اظہار اختیار کریگا - اگر وہ اس میں کامیاب ہو گیا تو یقیناً وہ اپنے زمانہ کا بہت بڑا شاعر ہے - لیکن بیشتر حالتوں میں یہ دیکھا گیا ہے کہ اب اس قسم کی ایجاد کی گنجائش کم ہے - البتہ گنجائش اصلاح کی ضرور ہے اور وہ ہر زمانہ میں رہیگی - ایجاد کی گنجائش اس لئے کم ہے کہ صدہا شعرا صدہا سال سے مختلف شکلوں میں اپنے جذبات کا اظہار کرتے چلے آئے ہیں اور انہوں نے مشکل سے کوئی ایسی صنف باقی چھوڑی ہے جس میں جدت کا مکمل طور پر کوئی انداز پایا جائے اس لئے جب کوئی شاعر کچھ کہنا شروع کرتا ہے تو وہی پرانے اصناف سخن سامنے آتے ہیں اور وہ اپنی طبیعت کے مطابق ایک صنف منتخب کرلیتا ہے اور اسی میں شعر کہتا ہے - اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ صنف معنی یا جذبات پر اظہار کے وقت بیرونی طور پر پابندیاں عائد کرتی ہے - نہیں ایسا ہرگز نہیں ہے - صورت کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو معنی پر خارجی طور پر عائد کردی جائے بلکہ اسکا رشتہ معنی کے ساتھہ تو جسم و روح کا ہے - جب معنی لامحدود سے محدود میں قدم رکھتا ہے تو وہ ایک صورت اختیار کر لیتا

ہے - لیکن اگر کوئی شرق سے غزل کہتا ہے تو یہ سمجھنا چاہئے کہ یہ اس کی طبیعت کا بہترین طرز اظہار ہے - علاوہ بریں اگر ایک شخص غزل کا میدان اپنے لئے منتخب کرتا ہے تو وہ درحقیقت بڑے بڑے پیشرو شعرا کے جذبات میں شریک ہوتا ہے جو اس صنف میں شعر کہہ چکے ہیں - اسی لئے آپ دیکھیں گے کہ جتنے بڑے بڑے غزل گو شعرا ہیں اُن میں کہیں نہ کہیں ایک طرح کی روحانی یگانگت پائی جاتی ہے - اس یگانگت کو معمولی درجہ کا نقاد اکثر سرقہ اور توارد کی بحث میں لاتا ہے اور کسی کو کسی پر فضیلت دینے کی کوشش کرتا ہے حالانکہ واقعہ بالکل اس کے خلاف ہے -

اصناف شاعری اور مصطلحات شاعری کو اگر قیود کہا جائے تو ان ' قیود ' سے شاعر کی رہنمائی مقصود ہے کیونکہ اصل ضرورت تو معنی کا اظہار ہے اور یہ اظہار صورت کے ذریعہ ہوتا ہے - اس لئے بہترین صاحب فن وہ ہے جو معنی و صورت میں بہترین طریقہ پر ہم آہنگی پیدا کرتا ہے - جب یہ ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے تو اس وقت صورت و معنی اس طرح آپس میں پیوست ہوجاتے ہیں کہ یہ بتانا سخت مشکل ہو جاتا ہے کہ کون سا حصہ معنی کا ہے اور کون سا صورت کا کیونکہ آرٹ نہ تو اسوقت پوری طرح مادی ہوتا ہے نہ روحانی بلکہ روح اور مادہ کا معتدل امتزاج ہوتا ہے - آرٹ کی دنیا میں اس امتزاج سے جو چیز بنتی ہے وہ حسین کہلاتی ہے اور جو صاحب فن اپنے آرٹ میں یہ کیفیت حاصل کرلیتا ہے وہ صاحب کمال ہوتا ہے -

(۴)

حسین اور بد صورت کا تعلق

جیسا ہم بتا چکے ہیں آرٹ کی دنیا میں معنی اور صورت کی ہم آہنگی سے حسین چیز تیار ہوتی ہے اور اس میں ایک کُل کی شان پائی جاتی ہے - کل کی یہ کیفیت اجزاء کی کیفیت کی آئینہ دار ہوتی ہے - یعنی اگر کسی

خاص جزو پر نسبتاً زیادہ زور دیا گیا ھے یا کسی جزو کو زیادہ واضح کیا گیا ھے تو کل پر اس کا اثر پڑنا لازمی ھوگا - پھر اجزا آپس میں کس طرح ملتے ھیں اسکی جھلک بھی کل میں ظاھر ھوگی - پھر صاحب فن کی مشق اور صورت گري کے لوازم کو صحیح صحیح استعمال کرنے پر بہت کچھ کل کا دار مدار ھوتا ھے - اگر صاحب فن ایک باکمال مصور ھے تو رنگوں کي آمیزش اور نقوش کي دلفریبی میں اسکی چابکدستی نمایاں ھوگی - اگر شاعر ھے تو الفاظ کے انتخاب ' بندش کي چستی اور صفائی وغیرہ کا اثر تمام کلام پر پڑیگا - جس طرح کسي تصویر پر ظاھری رنگ و روغن کا اثر پڑتا ھے اسی طرح اس کا بھي اثر پڑتا ھے کہ صاحب فن کس خیال کو ادا کرنا چاھتا ھے اور کون سے معني کو فن کا جامہ پہنانا چاھتا ھے - اور جو کچھ وہ ظاھر کرنا چاھتا ھے آیا وہ کوئي بڑا یا معمولي ' ناقص یا تکلیف دہ خیال ھے - اگر کسی بڑے خیال کو خوبي سے فن میں منتقل کردیا گیا ھے تو وہ فن نہ صرف کامل بلکہ عظیم ھوتا ھے - لیکن اگر خیال معمولی ھے اور اس کے حسب حال فني آرائش کردی گئي ھے تو فن میں کمال تو ھوگا مگر عظمت نہ ھوگی - پھر کل پر اس کا اثر بھی پڑیگا کہ اس کل میں معنی پر زیادہ زور دیا گیا ھے یا صورت پر - آرٹ میں ایسے نمونے بہت مل سکتے ھیں جہاں نسبتاً یا تو معنی پر زور دیا گیا ھے یا صورت پر - اول معنی پر زور دینے کی مثال لیجئے :—

جلا ھے جسم جہاں دل بھي جل گیا ھوگا
کریدتے ھو ' جو اب راکھ، جستجو کیا ھے

خدا شرمائے ھاتھوں کو کہ رکھتے ھیں کشاکش میں
کبھی میرے گریباں کو کبھی جاناں کے دامن کو

یا آتش کا یہ مصرع—درد درماں سے المضاف ہوا -

ان اشعار میں معنی پر بہ‌نسبت صورت کے زیادہ زور دیا گیا ھے جس کا اثر کل پر پڑا ھے اور کل میں کچھ ' خامی ' ھوگئی ھے - اسی طرح جہاں صورت پر بہ‌نسبت معنی کے زیادہ زور دیا جاتا ھے وھاں صورت تو آگے بڑھ جاتی ھے اور معنی پیچھے رہ جاتا ھے - اس حالت میں ایک طرح کا بھدا پن ظاھر ھوتا ھے - مثلاً :—

سر شکم بے تو رفتہ رفتہ در یاشد تماشا کن
بیادر کشتی چشمم نشین و سیر دریا کن

کہنا صرف اتنا ھے کہ میں تیرے فراق میں بہت رویا مگر شاعر نے بیان میں اتنا مبالغہ کیا کہ آنسوؤں کو دریا کر دیا اور پھر دریا سے کشتی کا خیال آیا اور معشوق کو کشتی چشم میں سیر کی دعوت بھی دیدی گئی - یہاں تھوڑے سے معنی کو الفاظ کا بہت بڑا جامہ پہنا دیا گیا ھے جس سے کل پر اثر پڑا اور کل انمل بے جوڑ سا ھوگیا - اسی طرح کسی کا شعر ھے :—

باغ کو پاکے آئینہ حسن و جمال یار کا
مجھکو جنون ھوگیا نام ھوا بہار کا

یہاں معنی اچھا خاصا بلند ھے مگر شعر پڑھنے کے بعد بجائے معنی کے آپ کا ذھن اس ٹکڑے پر کہ "نام ھوا بہار کا" فوراً چلا جاتا ھے اور آپ یہ سمجھتے ھیں کہ واہ ! کیا بات ھے - کام کسی نے کیا اور نام کسی کا ھوا - اصل معنی یعنی باغ جو حسن یار کا آئینہ تھا اور جس سے مجھکو جنوں ھوگیا پس پشت پڑ گیا - اب خیال بس اسی طرف ھے کہ بہار کا نام کیوں ھوا ؟ یہاں الفاظ کے اس ٹکڑے " نام ھوا بہار کا "

پر زور دینے کی وجہ سے ایک طرح کا سقم پیدا ہوگیا ہے جس کا اثر سارے شعر پر پڑا اور اس اثر نے اس شعر کو اصل معنی سے ہٹا کر بذلہ سنجی یا Wit کی حد میں داخل کردیا ہے -

لیکن جہاں معنی و صورت میں ہم آہنگی ہوتی ہے آرٹ کی دنیا میں وہاں حسین چیز نمایاں ہوتی ہے - مثلاً :—

قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

یہاں معلوم ہوتا ہے کہ معنی و صورت میں کمال ہم آہنگی ہے -

آرٹ کا کمال ہے کہ معنی کا اظہار بہترین طور پر ہو - جب صورت سے معنی کا اور معنی سے صورت کا اظہار ہو تو ہم سمجھتے ہیں کہ یہ اظہار کا کمال ہے - اس وقت صورت معنی کا اور معنی صورت کا ایک جزو لاینفک بن جاتی ہے - جب آرٹ میں اس طرح دونوں کا باہم اتصال ہوتا ہے تو ہم اس کو حسین کہتے ہیں - لیکن مغربی نقادوں کے بقول جب معنی کا اظہار صورت میں مکمل طور پر نہیں ہوتا تو آرٹ بدصورت ہوجاتا ہے گویا بدصورتی کا معیار نامکمل اظہار ہے - بدصورتی قطعی نہیں بلکہ ایک اضافی چیز ہے - یہ اضافیت شخصیت کے اختلاف ، زمانہ کے اختلاف اور ماحول کے اختلاف پر مبنی ہوتی ہے - یعنی جو چیز آج زید کو بدصورت اور ناگوار معلوم ہوتی ہے ممکن ہے وہی چیز بکر کو حسین معلوم ہو اور ممکن ہے کچھ دنوں کے بعد خود زید کو حسین معلوم ہونے لگے - ایک ہی زمانہ میں ایک ہی چیز کو نگاہ کے مختلف زاویوں سے دیکھنا ذرا مشکل بھی معلوم ہوتا ہے کیونکہ ماحول کی تبدیلی اور زمانہ کے تغیر بغیر زاویہ نگاہ نہیں بدلتا اور تغیر کے بعد

ممکن ہے کہ جو چیز پہلے بدصورت رہی ہو بعد کو حسین معلوم ہونے لگے - مرزا غالب کا کلام اس کی بین مثال ہے - خود مرزا کے زمانہ میں لوگ ان کی مشکل گوئی کا مذاق اڑاتے تھے کہ وہ مہمل گو ہیں لیکن سچ پوچھئے تو واقعہ یوں تھا کہ وہ نفسی حیثیت سے اپنے زمانہ سے بہت آگے تھے - جب زمانہ نے پلٹا کھایا ' ماحول بدلا اور نئے نئے علوم کی روشنی نمودار ہوئی تو مرزا کی شخصیت اس روشنی میں اور زیادہ نمایاں ہوگئی - مرزا کی اکثر غزلیں اور اُن کے اکثر اشعار ایسے ہیں جن کا مطلب ایک ماہر نفسیات بہ‌نسبت ایک عامی کے بہتر سمجھ سکتا ہے - مرزا کی اس غزل

سوزش باطن کے ہیں احباب منکر ورنہ یاں
دل محیط گریہ و لب آشنائے خندہ ہے

کا مطلب کتنا مشکل نظر آتا تھا لیکن جب ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری نے فرانس کے مشہور فلسفی برگسان کی سند پیش کی تو معلوم ہوا کہ مرزا کا قول بالکل درست ہے اور جو چیز پہلے بدصورت معلوم ہوتی تھی وہ اب عین حسن ہوگی - اس میدان میں غلطی اکثر یوں ہوتی ہے کہ اکثر لوگ جلدی میں صرف ظاہری پیکر کے بعض پہلو دیکھکر فوراً کل معنی پر حکم لگا دیتے ہیں اور شاعر کی اندرونی کیفیتوں اور کاوشوں کو سمجھنے کی بالکل کوشش نہیں کرتے - ڈاکٹر اقبال کی شکایت اس معاملہ میں بالکل بجا ہے کہ

کم نظر بے تابی جانم نہ دید
آشکارم دید و پنہا نم نہ دید

اس لحاظ سے قطعی یا مطلق بدصورتی ناممکن ہے - ممکن ہے کوئی جزو محض جزو کی حیثیت سے بدصورت ہو لیکن مجموعی حالت سے

اس کائنات میں کوئی چیز بدصورت نہیں - مولانا ابوالکلام آزاد اپنی ایک تازہ تصنیف میں فرماتے ہیں :—

"یہ دنیا عالم کون وفساد ہے—یہاں ہر بننے کے ساتھ بگڑنا ہے اور ہر سمٹنے کے ساتھ بکھرنا - لیکن جس طرح سنگ تراش کا توڑنا پھوڑنا بھی اس لئے ہوتا ہے کہ خوبی و دل آویزی کا ایک پیکر تیار کر دے اسی طرح کائنات عالم کا تمام بگاڑ بھی اسی لئے ہے تاکہ بناؤ اور خوبی کا فیضان ظہور میں آئے - تم ایک عمارت بناتے ہو لیکن اس بنانے کا کیا مطلب ہوتا ہے ؟ کیا یہی نہیں ہوتا کہ بہت سی بنی ہوئی چیزیں 'بگڑ گئیں' - چٹانیں اگر نہ کاٹی جاتیں اور بھٹے اگر نہ سلگائے جاتے' درختوں پر آرہ اگر نہ چلتا تو ظاہر ہے عمارت کا بناؤ بھی ظہور میں نہ آتا - پھر یہ راحت و سکوں جو تمہیں ایک عمارت کی سکونت سے حاصل ہوتا ہے کس صورت حال کا نتیجہ ہے ؟ یقیناً اسی شور و شر اور ہنگامۂ تخریب کا جو سرو سامان تعمیر کی جدو جہد نے عرصہ تک جاری رکھا تھا - اگر تعمیر کا یہ شور وشر نہ ہوتا تو عمارت کا عیش و سکون بھی وجود میں نہ آتا......
اگر سمندر میں طوفان نہ اٹھتے تو میدانوں کی زندگی وشادابی کے لئے ایک قطرۂ بارش میسر نہ آتا - اگر بادل کی گرج اور بجلی کی کڑک نہ ہوتی تو باران رحمت کا فیضان نہ ہوتا - اگر آتش فشان پہاڑوں کی چوٹیاں نہ پھٹتیں تو زمین کے اندر کا کھولتا ہوا مادہ کرہ کی سطح کو پارہ پارہ کردیتا......فطرت کی سب سے بڑی بخشائش اس کا عالمگیر حسن و جمال ہے - فطرت صرف بناتی اور سنوارتی ہی نہیں بلکہ اس طرح بناتی اور سنوارتی ہے کہ اس کے ہربناؤ میں حسن و زیبائی کا جلوہ اور اس کے ہر ظہور میں نظر افروزی و روح پروری کی نمود پیدا ہوگئی ہے - کائنات ہستی کو اس کی مجموعی حیثیت سے

دیکھو یا اس کے ایک ایک گوشہ خلقت پر نظر ڈالو - اس کا کوئی رخ نہیں جس پر حسن و رعنائی نے ایک نقاب زیبائش نہ ڈالدی ہو - غرضکہ تمام تماشا گاہ ہستی حسن کی نمایش اور نظر افروزی کی جلوہ گاہ ہے - "

اسی لحاظ سے مجموعی طور پر دنیا میں اگر کسی چیز پر نظر ڈالی جائے تو وہ کبھی بدصورت نظر نہ آئیگی - لیکن اگر کسی جزو کو کل سے علیحدہ کرکے دیکھا جائے تو اس میں بدصورتی کا امکان ہے - پھر ایک جزو دوسرے جزو سے موازنہ و مقابلہ کے وقت بہتر اور حسین تر نظر آسکتا ہے - یعنی ایک جزو دوسرے سے نسبتاً نامکمل اور بے ترتیب اور اس لئے بدصورت ہوسکتا ہے - لیکن اس بدصورتی کا دار مدار طرز نظر پر ہے اور جہاں تک اس بدصورتی کا اثر کسی کی طرز نظر سے وابستہ ہے یہ فرق بالکل حقیقی ہے اس لئے بدصورتی کتاب حسن کا ایک باب ہے - اس کتاب سے الگ ہوکر اسکی کوئی حیثیت نہیں یعنی ایک چیز جہاں تک نامکمل ہے بدصورت ہے اور جب یہ چیز ترتیب اور کمال حاصل کرلیتی ہے تو حسین ہوجاتی ہے - ڈاکٹر بوسنکٹ کا قول ہے کہ اسی قسم کی بدصورتی کا ایک نمونہ اور بھی ہے یعنی جہاں صحیح جذبات نہ ہوں لیکن صحیح اظہار کی نقل کی جائے وہاں بدصورتی کا ظہور ہوتا ہے - اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ معنی اور صورت سے ہم آہنگی اٹھ جاتی ہے اور آرٹ کا ایک بدصورت نمونہ نمایاں ہوتا ہے - اگر صحیح اور مخلص جذبات سے متاثر ہوئے بغیر پر اثر طرز اظہار کی کوشش کی جائے یا کسی شاعر کا کلام سامنے رکھکر اس کی نقل کی جائے تو جو چیز ظاہر ہوگی وہ نامکمل اور بے ترتیب ہوگی اور اس لئے بدصورت ہوگی - اور یہ کوشش کبھی کامیاب بھی نہیں ہوسکتی کیونکہ نقل کرنے والا بازیگری کے اچھے کمالات شاید مشق سخن سے دکھا

دے مگر وہ دل اور جذبات نہیں رکھتا جس سے اچھے شعر نکلتے ہیں - مثال کے طور پر آپ فارسی میں شفائی کا کلام لیجئے - علامہ شبلی لکھتے ہیں کہ انہوں نے غزل میں جذبات درد اور سوز و گداز کی نقل کرنے کی بہت کوشش کی مگر نتیجہ یہ نکلا کہ یہ نری نقّالی اور کاغذی پھول بن کر رہ گئے - اردو میں بھی ایسے 'شعرا' بہت مل سکتے ہیں جو ایک مصرع طرح دیئے پر دم بھر میں سیکڑوں ایسے اشعار موزوں کر دیں جو زبان و محاورہ ' بندش و صفائی کے لحاظ سے تو بہتر معلوم ہوں مگر ان اشعار میں جذبات مفقود ہوں یعنی یہ معلوم نہ ہوسکے کہ جو شاعر کہہ رہا ہے اسے محسوس بھی کر رہا ہے - ایسے "شعرا" کا بڑا کمال یہ ہے کہ انہوں نے بدصورت چیز کے پیدا کرنے میں بڑی مہارت حاصل کی ہے اور غزل کے رنگ کا شعر موزوں کر دیتے ہیں - یہی وہ کاغذی پھول ہیں جو کسی سادہ دل کو شاید تھوڑی دیر کے لئے تو ضرور دھوکے میں ڈال دیں مگر ایک صاحب نظر ان سے فوراً آگاہ ہوجاتا ہے -

مغربی نقادوں کی غلطیاں

آج کل مغرب میں اطالیہ کا مشہور فلسفی کروچے جمالیات کے نقادوں کا سر گروہ مانا جاتا ہے - اس کے نظریوں نے فن نقد پر بہت بڑا اثر ڈالا ہے اور موجودہ زمانہ کے تقریباً تمام بڑے بڑے نقاد اس کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہیں - اس کی تحریروں نے اس تاریک مگر دلفریب راستہ میں نہ صرف مشعل کا کام کیا ہے بلکہ راستہ بھی بڑی حد تک ہموار کیا ہے - کروچے کا قول ہے کہ معنی کا ذریعہ الہام اور بصیرت ہے اور چونکہ اس کے خیال کے مطابق یہ بصیرت مکمل طور پر آرٹ میں الہام کے وقت ہی نمایاں ہوتی ہے اس لئے آرٹ بھی الہام ہوا - یعنی جو صاحب نظر ہے وہی اعلی درجہ کا صاحب فن بھی ہوسکتا ہے - پھر وہ کہتا ہے کہ آرٹ کا کمال یہ ہے کہ معنی کا

مکمل طور پر صورت کے ذریعہ اظہار ہو اور جب یہ اظہار ہوتا ہے تو معنی اور صورت میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا گویا صورت معنی کا دوسرا نام ہے - جو معنی ہے وہی صورت ہے - مکمل اظہار کے وقت آرٹ حسین ہوتا ہے لیکن اگر ذرا بھی اظہار میں خامی رہ گئی تو آرٹ اس حد تک بد صورت رہیگا -

ہم الہام پر پہلے لکھ چکے ہیں - یہاں صرف اتنا کہنا چاہتے ہیں کہ جب کسی شخص پر یہ الہامی کیفیت طاری ہوتی ہے تو اس وقت وہ ایک بیخودی کے عالم میں ہوتا ہے - اس کے ظاہری حواس بڑی حد تک مختل ہوجاتے ہیں - اس وقت وہ ایک دوسری دنیا میں ہوتا ہے جہاں عالم کی حقیقت اور زندگی کا راز اس پر منکشف ہوتا ہے - اس وقت اس کو شاید ہی یہ خیال گذرتا ہو کہ وہ فوراً اس کیفیت کا اظہار کرے - یہ کیفیت چونکہ دیر تک قائم نہیں رہتی اس لئے جب وہ اپنے ظاہری حواس کی سرحد میں واپس آجاتا ہے تو پھر اسکو " بادۂ شبانہ " کی سرمستیاں یاد آتی ہیں اور تخیل و تصور سے کام لیکر وہ صورت گری کرتا ہے اور ان حقائق کی تشکیل کرتا ہے اور چونکہ اس پر بہت کچھ اس 'خواب' کا اثر باقی رہتا ہے اس لئے الفاظ میں وہی جذباتی شان پائی جاتی ہے - اگر آپ ایسے اصحاب کے حالات اور ان کے مراقبوں کی کیفیتوں کا حال پڑھیں تو ان سے معلوم ہوگا کہ جب ان لوگوں پر یہ کیفیت طاری ہوتی تھی تو ظاہری طور پر وہ بالکل بے خبری کے عالم میں ہوتے تھے اور ان کو اس وقت اس کا خیال تک نہ ہوتا تھا کہ وہ کچھ ظاہر کریں - اظہار کا خیال تو بعد کی کیفیت ہے - اس لحاظ سے فن بذاتہ الہام نہیں بلکہ اس الہام کی ایک تخئیلی تصویر ہوتی ہے - لیکن

یہ تصویر بہت کچھ صحیح تصویر ہوتی ہے اور اصل کي طرف اشارہ کرتي ہے اور اُصل کي یاد دلاتي ہے -

دوسری بات کروچے کے قول کے مطابق یہ ہے کہ معانی کا جلوہ مکمل طور پر صورت میں ظاہر ہوتا ہے - وہ کہتا ہے کہ "بعض لوگوں کا یہ خیال کتنا تمسخر انگیز ہے جو کہتے ہیں کہ ان کے ذہن میں کوئی بڑا خیال آیا ہے مگر وہ ظاہر نہیں کرسکتے یا کسی عمدہ اور اچھی تصویر کا نقشہ سمجھ میں آیا ہے مگر اس کو کاغذ پر نہیں اتار سکتے" - وہ کہتا ہے کہ جب تک بڑا خیال مکمل طور پر متشکّل نہ ہوجائے وہ کوئی بڑا خیال ہی نہیں ہے - اس کے خیال میں معنی کا عدم اظہار معنی کی خامی کي دلیل ہے - لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ بڑے خیالات کا مکمل طور پر اظہار ناممکن ہے - ممکن ہے کسي معمولي چیز کا خاطر خواہ اظہار ہوجائے اور ہوتا بھی ہے لیکن جس کا سینہ اُس عالم آب و گل کی راز داری کریگا ' جس کی نظر زندگي کے نشیب و فراز سے آشنا ہوگي اس کی زبان بڑی حد تک گنگ ہوجائیگی - اس سے مکمل اظہار ناممکن نہیں بلکہ محال ہے - وہ جانتا ہے مگر دوسروں کو بتا نہیں سکتا -

بسیار شیوہ ہاست بتان راکہ نام نیست

جب گوتم بدھ سے اسکے چند چیلوں نے موت کے بعد کي کیفیات کا کچھ حال دریافت کیا تو بدھ جي نے خاموشي اختیار کي اور خاموش رہنے کی تلقین بھی کی - اس خاموشی کا مطلب یہ تو نہ تھا کہ وہ اس چیز سے بے خبر تھے بلکہ خاموشی ہی ان سوالات کا جواب تھي یعنی ان سوالات کا جواب کسی غیر سے نہیں مل سکتا بلکہ جواب خود ایک ناقابل اظہار طریقہ پر روح پر منکشف ہوجائیگا - اسیطرح جب پیغمبر اسلام سے لوگوں نے پوچھا کہ روح کیا چیز ہے تو انہوں نے جواب دیا کہ یہ خدا کا حکم ہے اور خاموش ہوگئے -

انسان کی روح جب حقیقت کا پتہ لگاتی ھے تو اُس وقت اس سے حقیقت کا مکمل اظہار نہیں ہوسکتا - اس علم کا تقاضا ھے کہ\انسان خاموش رھے - مرزا غالب کہتے ھیں :—

بزم میں اس کے روبرو کیوں نہ خموش بیٹھئے
اس کی تو خامشی میں بھی ھے یہی مدعا کہ یوں

حقیقت چونکہ بے شکل اور بے صورت ھے اس لئے اسکو مکمل طور پر صورت کے طلسم میں اسیر کرنا محال ھے - لیکن صاحب فن کا یہ کمال ھے کہ وہ ایک عالم کی چیز کو دوسرے عالم کی چیزوں کی مدد سے رنگ بدل کر تھوڑا بہت ظاھر کرتا ھے اور آرٹ میں جب اس کا ظہور ہوتا ھے تو آرٹ اشاریہ ہوجاتا ھے یعنی آرٹ اس حقیقت علوی کو بتاتا تو نہیں مگر اس کی طرف اشارہ کردیتا ھے - صرف اس اشارہ میں ہزاروں اظہار پوشیدہ ہوتے ھیں - خیام نے کہا ھے :—

قدرِ گل و مل بادہ پرستان دانند
نے تنگ دلان و تنگ دستان دانند
از بے خبری بے خردان معذور اند
ذوقے ست دریں بادہ کہ مستان دانند

اس لحاظ سے حقیقت کا مکمل نہ سہی مگر کچھ نہ کچھ اشارۃً اظہار تو ضرور ہوتا ھے - بقول اصغر :—

حسن ساقی کا تو مستوں کو زرا ھوش نہیں
کچھ جھلک اس کی سر پردۂ مینا دیکھیں

اگر کروچے کے قول کو سند تسلیم کرلیا جائے تو یہ نامکمل اظہار آرٹ کی بدصورتی ہوگی حالانکہ ایک اھل نظر کے لئے یہ حسن کا مخزن ھے - آپ آگ جلاتے ھیں تو لکڑی کے جلنے کے بعد آپ کے

سامنے راکھ، کا ڈھیر ہوتا ھے - آپ رات کو شمع روشن کرتے ھیں تو پروانے آکر جلتے ھیں اور جل کر راکھ ہوجاتے ھیں - صبح کے وقت شمع کے پاس بھی راکھ کا ایک ڈھیر ہوتا ھے - لکڑی کی راکھ اور پروانوں کی راکھ دونوں بہر حال راکھ ھیں - ایک عامی شاید ان میں تمیز نہ کرسکے لیکن ایک اہل نظر فوراً سمجھ لیگا کہ پروانہ کی راکھ کچھ اور کہہ رهي هے - اس کی راکھ میں بیقراري اور اضطراب کے افسانے ھیں جو زبان حال سے بیان ہو رہے ھیں - پھر کون ھے جو اس خاموشی کو عدم اظہار سے تعبیر کریگا - میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ حسن اور بدصورتی کا دار و مدار نظر پر ھے - پھر کہا یہ مشرق و مغرب کے طرز نظر کا فرق نہیں ھے -

موجودہ دور کے ایک شاعر نے کیا خوب کہا ھے :—

دل مرا توڑ کر کہا اس نے زبان راز میں
ساز میں نغمے وہ کہاں جو ھیں شکست ساز میں

(۵)

صاحب فن کي بزرگی و عظمت

هم بتا چکے ھیں کہ فن میں کمال کے کیا معنی ہوتے ھیں یعنی جب صاحب فن مناسب طریقہ پر معنی اور صورت کا اتصال کرتا ھے تو اس کا یہ عمل درجہ کمال پر پہونچتا ھے - لیکن ایک چیز اور بھی ھے جو اس کمال میں شامل بھی ھے اور الگ بھی اور وہ صاحب فن کی بزرگی و عظمت ھے - یہ بالکل ممکن ھے کہ ایک شاعر شاعری میں کمال رکھنے کے باوجود بڑا شاعر نہ ہو یعنی اس کے الفاظ موزوں اور معنی سلجھے ہوئے ہوں مگر وہ بڑا شاعر نہ ہو - یہ صورت عام ھے اور تقریباً ہر 'کہنہ مشق' شاعر کا شمار اس گروہ میں ہوسکتا ھے - دوسری صورت یہ ھے کہ کمال کے

ساتھ ساتھ بڑا شاعر بھی ہو - یہ صورت بہت مشکل اور تقریباً محال ہے - تیسری صورت یہ ہے کہ الفاظ کے انتخاب اور بندھش کی صفائی میں کچھ کمی رہ گئی ہو مگر وہ شاعر بزرگ ہو - جزو کی اس خامی سے یہ لازم نہیں آتا کہ کل مکمل طور پر ناقص ہوگیا - مرزا غالب کا کلام دیکھئے - وہاں محاورات کا پورا اہتمام نہیں - اکثر نامانوس و غریب الفاظ بھی آجاتے ہیں مگر اس کے باوجود ان کو شاعر اعظم تسلیم کرنے میں کون انکار کرسکتا ہے - برخلاف اس کے مصحفی ' جرات و ناسخ وغیرہ کا کلام دیکھئے - کیل کانٹے سے لیس ' قاعدہ کی پابندی میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا گیا ہے - الفاظ کے درو بست میں کافی اہتمام ہے - بالخصوص ناسخ کا کلام تو محاورہ کی غلطیوں سے بہت بڑی حد تک پاک ہے مگر اس کے باوجود کیا ان کو شاعر اعظم تسلیم کیا جاسکتا ہے ؟ نہیں ' ہرگز نہیں - کیونکہ ان کا کلام مجموعی طور پر معنی کی بلندی سے خالی ہے - اگر بڑے شعرا کے کلام کا استقراء کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان کی شاعرانہ عظمت ان کے پیکر سے زیادہ ان کی معنویت میں پنہاں ہوتی ہے - یعنی جس قسم کے خیال کا اظہار ہوا ہے وہ کوئی بڑا خیال ہے اور اس خیال میں نفس انسانی کے کتنے دقیق و نازک مسئلے حل ہوئے ہیں - اس میں انسان کو خود اپنی صورت نظر آتی ہے - معلوم ہوا کہ شاعرانہ عظمت کے لئے ضرورت ہے بزرگ معنی کی ' بزرگ خیال کی -

آپ کچھ اشعار پڑھتے ہیں یا متعدد تصاویر دیکھتے ہیں تو آپ کو معلوم ہوجاتا ہے کہ کس شعر میں یا کس تصویر میں کوئی بڑا خیال ادا کیا گیا ہے - مثلاً جب یہ اشعار پڑھے جائیں :—

میرا سینہ ہے مشرق آفتاب داغ ہجراں کا
طلوع صبح محشر چاک ہے اپنے گریباں کا

——— ۱

دکھلوں کا تماشا دي اگر فرصت زمانے نے
مرا هر داغ دل اک تخم هے سر و چراغاں کا

تو آپ سمجھتے هیں که موخرالذکر کے شعر میں حزن و یاس کی جو کیفیت بیان کی گئی هے وہ به نسبت پہلے شعر کے نفس انسانی سے قریب تر هے اور اس لئے آپ پر اسکا اثر هوتا هے اور آپ شاعر کی عظمت کے قائل هوجاتے هیں - اس سے یه بھی معلوم هوتا هے که فن اور زندگی کے درمیان ایک باطنی رشته هے اور اس رشته کے ذریعه فن کی برابر آبیاری هوتی رهتی هے - اگر یه آبیاری نه هو تو فن بھی بزرگ نه هو - لیکن نفس مضمون میں عظمت کی کیا پہچان هے ؟ اگر یه کہا جاے که انسان کھاتا هے ' پیتا هے ' سوتا هے ' هنستا هے ' روتا هے تو یه ایک معمولی حقیقت کا اظہار هوا لیکن اسی کے ساتھ ساتھ اگر یه کہا جائے که انسان زندگی و موت اکی حقیقتوں پر غور کرتا هے ' اپنے دل کے راز هائے سر بسته کے جاننے میں سر گرداں هے ' رنج و غم کے اسباب جاننا چاهتا هے نیکی اور بدی کی اصلیت سے واقف هونے کی تمنا رکھتا هے تو یه بڑی حقیقتیں کہی جائینگی - عظمت کا تقاضا هے که انسان اور کائنات کے تمام ممکن پہلوؤں پر نظر ڈالی جائے اور ان کو کل کی حیثیت سے دیکھا جائے - اور بلند کو بلند اور پست کو پست کہا جائے - اس حفظ مراتب هی سے نظر میں بلندی پیدا هوتی هے - اس لحاظ سے عظمت کے لئے ضروری هے که جو صورت بنائی گئی هے وہ فطرت انسانی کی بے شمار باریکیوں اور گہرائیوں کي هم آهنگی کے ساتھ ترجمان هو - گویا صورت ایک آئینه هو جس میں انسان اپنی مکمل هستی دیکھ سکے - یه آئینه جتنا هی صاف و شفاف هوگا اتنا هی صورت صاف نظر آئیگی اور اتنا هی آئینه ساز کی بزرگی اور عظمت پر دال هوگی - انگلستان کے

مشہور شاعر شیکسپیر کا شمار (حالانکہ صورت گری یعلی زبان ، محاورہ و طرز ادا کی اس کے یہاں میں بہت خامیاں ہیں) دنیا کے بڑے شاعروں میں اسی لئے ہوتا ہے کہ اس نے فطرت انسانی کے چہرہ سے نقاب الٹ دی ہے اور اپنے ڈراموں کے ذریعہ اس نے جو آئینہ تیار کیا ہے اس پر حقیقت کا عکس پڑتا ہے -

لیکن یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہماری طبیعت آخر عظمت کی طرف کیوں رجوع ہوتی ہے اور کیوں بزرگی کی طرف بڑھتی ہے - بات یہ ہے جیسا کہ ایک مشہور فلسفی لانجینس کا قول ہے کہ انسان کے اندر ایک ناقابل تسخیر خواہش پیدا کی گئی ہے جو اسکو ہمیشہ اپنے سے بلند ، برتر اور مافوق الفطرت چیز کی طرف لیجاتی ہے - یہ خواہش تخیل کے زور سے پیدا ہوتی ہے اور انسان کو ایک ایسی بلند اور برتر فضا میں پرواز کی دعوت دیتی ہے جہاں سے کل کا نظارہ ہوسکے - شاید یہی وجہ ہے کہ جب ہم دریا کے مقابلہ میں سمندر اور میدان کے مقابلہ میں پہاڑ دیکھتے ہیں تو دل بے اختیار سمندر کی گہرائی اور پہاڑ کی بلندی کی طرف کھنچتا ہے - قطرہ کی خواہش ہوتی ہے کہ دریا سے اور ذرہ کی خواہش ہوتی ہے کہ آفتاب سے مل جائے اور دونوں کی یہ خواہش مطابق فطرت ہے اور دونوں کے عظمت کی دلیل بھی یہی ہے - گوئٹے نے بھی ایک جگہہ کہا ہے کہ ' ہماری یہ خواہش ہوتی ہے کہ کوئی شے ہماری روحوں کو ابدی مسرت کا نغمہ چھیڑ کر بیدار کردے ' مرزا کہتے ہیں -

دل ہر قطرہ ہے ساز اناالبحر

ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

ہر قطرہ سے اناالبحر کی صدا نکلنا قطرہ کی عین فطرت ہے اور جب یہ صدا نکلتی ہے تو اس سے قطرہ کی عظمت کا اظہار ہوتا ہے - علامہ اقبال فرماتے ہیں :

تو ہے محیط بیکراں میں ہوں ذرا سی آبجو

یا مجھے ہم کنار کر یا مجھے بیکنار کر

فطرت کا یہ راز جس صاحب فن کی صنعت میں نمایاں ہوتا ہے وہی صاحب فن بزرگ ہوتا ہے کیونکہ اس کی صورت گری میں معنی کا کمال نظر آتا ہے -

لیکن یہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ جب معنی اپنے کمال پر پہونچتا ہے تو صورت میں خامیاں رہ جاتی ہیں - یہ خامیاں کیوں ہوتی ہیں ؟ ایک وجہ تو یہ ہے کہ صاحب فن سوسائٹی میں پلا ہے ' بڑھا ہے اور الفاظ و محاورہ وہی استعمال کرتا ہے جس کو سب استعمال کرتے ہیں یعنی صورت گری کا جو سامان وہ استعمال کرتا ہے اس پر سراسر اجتماعی رنگ غالب ہوتا ہے مگر اس کے جذبات ایک حد تک انفرادی ہوتے ہیں اس لئے اپنے جذبات کو اجتماعی رنگ میں ظاہر کرنے میں اس کو بڑی دقت ہوتی ہے - یہی وجہ ہے کہ اس کے پیکر میں خامیاں باقی رہ جاتی ہیں - دوسری وجہ جیسا اکثر لوگ سمجھتے ہیں یہ ہے کہ صاحب فن پیکر تراشی کے اعلی اصول سے واقف نہیں ہوتا اس لئے غلطی کرتا ہے حالانکہ واقعہ یہ نہیں ہے بلکہ یوں ہے کہ صاحب فن پیکر تراشی کے اصول سے ناواقف نہیں ہوتا بلکہ اس کے معانی اجماع کے مطابق تیار کئے ہوئے پیکر میں سما نہیں سکتے - اس لئے وہ اپنا راستہ الگ نکال لیتا ہے - ایک بزرگ صاحب فن اپنے زمانہ کے لوازم پیکر تراشی پر نگاہ ڈالتا ہے ' ان کو دیکھتا ہے اور جہاں تک اس کی طبیعت گوارا کرتی ہو وہاں تک ان لوازم کو

اپنے پیکر میں جذب کر لیتا ہے لیکن جہاں اس کے معنی بلند ہوتے ہیں وہاں وہ خود اظہار کے ذرائع پیدا کر لیتا ہے - اسی طرح اگر کسی بڑے شاعر میں اظہار کی خامیاں ہیں تو وہ اس لئے نہیں ہوتیں کہ وہ زبان و محاورہ سے بالکل ناواقف ہے بلکہ موجودہ محاورے اس کے جذبات کی تاب نہیں لاسکتے اس لئے اس کو شکست و ریخت سے کام لینا پڑتا ہے - علامہ اقبال کے اس شعر

کبھی اے حقیقت منتظر نظر آ لباس مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبین نیاز میں

پر بعض اصحاب اب تک معترض ہیں کہ سجدوں کا تڑپنا مہمل ہے اور یہ کوئی محاورہ نہیں - لیکن جس شخص پر یہ کیفیت نہ طاری ہوئی ہو وہ اس کیفیت کی حقیقت کیسے سمجھ سکتا ہے - میں پھر وہی شعر دھراؤں گا کہ

کم نظر بیتابی جانم نہ دید
آشکارم دید و پنہانم نہ دید

حالانکہ ضرورت ہے کہ شاعر کی اندرونی کیفیتوں کا پتہ لگایا جائے جیسا وہ خود فرماتے ہیں کہ :—

برگ گل رنگین ز مضمون من است
مصرع من قطرۂ خون من است

اس سلسلہ میں ذرا علامہ اقبال پر بھی تھوڑی سی نظر ڈال لیجئے - جس زمانہ میں اقبال نے شاعری شروع کی داغ و امیر کا طوطی بول رہا تھا - یہی دو اصحاب دھلی و لکھنؤ میں زبان دانی و فصاحت کی سند تسلیم کئے جاتے تھے - اقبال کو داغ سے تلمذ حاصل تھا جن کا اثر ان کے کلام پر صاف نمایاں ہے - اور امیر کے لئے تو وہ خود کہتے ہیں کہ :—

عجیب شے ہے صنم خانۂ امیر اقبال
میں بت پرست ہوں رکھدی کہیں جبین میں نے

ان کے علاوہ میر انیس کے وہ بے حد مداح ہیں اور شکوہ اور جواب شکوہ کے زور کلام میں میر انیس کا رنگ صاف جھلکتا ہے - اس لئے آپ دیکھیں گے کہ جہاں تک صورت کا تعلق ہے انہوں نے اپنے زمانہ کے فنی ترکہ سے خاصا فائدہ اتھایا ہے یعنی سامان فن و لوازم پیکر تراشی کے لحاظ سے ان کی شاعری گل و بلبل کی شاعری تو ضرور ہے مگر معنی کے لحاظ سے گل و بلبل کی روح سے بہت بلند ہے - یہ بلندی تقاضا ہے ان کے صاحب نظر ہونے کا جو گل و بلبل کے پیکر کے باوجود ان کو گل و بلبل کی روح سے بہت دور لے گیا - اس پرواز معنی میں ممکن ہے زبان کا پورا اهتمام نہ ہو مگر کلام کا اثر یقیناً بڑھ گیا ہے - علامہ اقبال خود فرماتے ہیں :—

حدیث بادہ و مینا و جام آتی نہیں مجھکو
نہ کر خارا شگافوں سے تقاضا شیشہ سازی کا

اگر آپ کسی بڑے شاعر کا کلام دیکھیں گے تو آپکو معلوم ہوگا کہ ہر بڑا شاعر اپنے زمانہ تک کے سامان فن سے آگاہ ہوتا ہے ' ایک حد تک ان سے استفادہ حاصل کرتا ہے اور اس کے بعد اپنے جذبات کے لحاظ سے الگ روش اختیار کرتا ہے - حافظ کے یہاں سلمان ساوجی ' خواجو اور سعدی کا کتنا اثر ہے - خود فرماتے ہیں :—

استاد غزل سعدی ست پیش همه کس اما
دارد سخن حافظ طرز و روش خواجو

بعد کو پھر حافظ کا اپنا علیحدہ رنگ کھلتا ہے اور وہ اپنی ایک خاص راہ اختیار کر لیتے ہیں -

اگر صاحب فن ہوا ہے تو وہ اپنے زمانہ کے فنی اصطلاحات کو جانتا ہے ' سمجھتا ہے اور انکو حسب ضرورت استعمال کرتا ہے لیکن اگر کہیں فن کے مسلمہ اصول کے خلاف ورزی کرتا ہے تو وہ دانستہ نہیں ہوتا بلکہ اس کا جوش طبیعت ' اس کا علوے تخیل اس کو زمین پیکر سے آسمان معنی کی طرف اُڑا کر لیجاتا ہے - اگر یہ پرواز نہ ہو تو سامان فن میں تغیر نہ آئے اور سامان فن کی ترقی رک جائے - علاوہ برین یہ پرواز دلیل اس بات کی بھی ہے کہ جوئے زندگی نے ایک نئی راہ اپنی روانی کے لئے تلاش کرلی اور اس جدت سے نہ صرف اس شخص کی ذات کو بلکہ اس زمانہ کے تمام لوگوں کو فنی تقویت اور روحانی مسرت ہوتی ہے - جرمنی کے مشہور شاعر شلر کا قول ہے کہ شاعر کسی شہر کا شہری نہیں ہوتا بلکہ وہ اپنے زمانہ کا شہری ہوتا ہے - اس سے مراد یہی ہے کہ وہ اپنے زمانہ سے حاصل کرتا ہے اور پھر اپنے زمانہ کو کچھ بخشتا بھی ہے -

(۶)

آرٹ اور اخلاق کے درمیان مدتوں سے جنگ چلی آتی ہے -

آرٹ اور اخلاق

جب ہم فریقین پر نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ بڑے بڑے فلسفی ' شاعر اور صاحبان فن کمریں کسے ہوئے باہم دست و گریبان ہیں - ایک گروہ کہتا ہے کہ فنون لطیفہ مثلاً شاعری ' بت تراشی ' مصوری وغیرہ کو آزادی صرف وہیں تک دینی چاہئے جہاں تک اخلاق اجازت دے لیکن جہاں فن تخریب اخلاق کے درپے ہوا وہیں اس سے سختی سے باز پرس کرنی چاہئے اور اس کو بہ جبر روک دینا چاہئے - یعنی اس گروہ کے مطابق آرٹ کو اخلاق کا تابع بن کر رہنا چاہئے اور ذرا سی سرکشی پر بھی اس کو سخت سے سخت سزا دینی چاہئے - اس گروہ میں اہل مذاہب بھی

شامل ہیں - دوسرے گروہ کا دعوی ہے کہ فن لطیف ایک آزاد فن ہے - اسکی ترقی عین روح کی ترقی ہے اور اسکا انحطاط روح کا انحطاط ہے - یہ انسان کے اندرونی سوز و گداز کا دفتر ہے جو مختلف صورتوں میں ظاہر ہوتا ہے - یہ روح کا ایک نعرۂ مستانہ ' ایک کیف بیخودی اور آتش نفسی کا ماحصل ہے - یہ وہ بلند مقام ہے جہاں ارادہ کا دخل نہیں ' نیت کا گزر نہیں ' عقل کے پر جلتے ہیں - پھر ایسی چیز جو سراسر ارادہ کی محتاج اور عقل کی دست نگر ہو اخلاق کے زیر اثر کیسے رہ سکتی ہے - غرض دونوں طرف سے خوب خوب معرکہ آرائیاں ہوتی چلی آئی ہیں - امتداد زمانہ کے ساتھہ اس معرکہ کے سپاہیوں کی حالت بھی بدلتی گئی - قرون وسطی میں گروہ اول کے اجارہ دار اہل مذاہب بن بیٹھے اور چونکہ وہ کلیسا کے مالک تھے اس لئے اُنہوں نے جیسا سکہ اپنی سلطنت میں چاہا چلایا - اٹھارھویں صدی کے آخر میں زمانہ نے پلٹا کھایا اور انقلاب فرانس رونما ہوا - عقلیت کی ترقی ہونے لگی اور اہل مذہب کا اثر کم ہوتا گیا - یہاں تک کہ انیسویں صدی کے اواخر سے ان دونوں فریقوں میں ایک فیصلہ کن جنگ شروع ہوئی جس میں اہل مذہب کو شکست ہوئی - اس کے بعد سے آرٹ کو اخلاق سے بر تر نہیں تو برابر ضرور سمجھا جانے لگا -

اگر آرٹ کا تعلق زندگی سے ہے اور اگر اخلاق کا مقصد زندگی کو سنوارنا ہے تو آرٹ اور اخلاق کے درمیان کوئی تعلق ضرور ہوگا -

یونانیوں میں یہ خیال کہ حسن اور نیکی ایک ہی چیز ہے اتنا عام تھا کہ اُن کی روزمرہ زندگی کا جزو بن گیا تھا - ان کے لئے اخلاق اور جمالیات دو علیحدہ چیزیں نہیں تھیں - وہ نیک آدمی کو حسین اور حسین کو نیک کہتے تھے - یونان کا مشہور ڈرامہ نگار سفوکلیز زندگی کے

نشیب و فراز پر حکیمانہ نظر رکھتا تھا اس نے کتاب زندگی کی پوری ورق گردانی کی تھی - اس کے ڈراموں کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک یونانی شہری کی زندگی میں حسن اور اخلاق میں گہرا اتحاد تھا - سفوکلیز زندگی کے تمام مظاہر میں نیکی کو سب سے زیادہ حسین کہتا ہے - اسی طرح پلاٹینس جس نے یونانی تہذیب کے کاروان رفتہ کا بڑی دقت نظر کے ساتھ جائزہ لیا ہے ' کا قول ہے کہ حسن اور نیکی ایک ہی چیز ہے اور حسن قدرت اور حسن عمل میں کوئی فرق نہیں -

آسانی ہوگی اگر ہم اس بحث کو دو بڑے حصوں میں تقسیم کردیں - پہلا حصہ تو اس سوال پر مبنی ہوگا کہ صاحب فن کے دل میں جو قدور اظہار سے قبل موجود ہیں انکا اظہار کے وقت اسکی طبیعت پر کیا اثر پڑتا ہے - یعنی صاحب فن کی طبیعت پر ان قدرون کا اخلاقی اثر کیا پڑتا ہے اور اس وقت صاحب فن کی طبیعت آیا مسرور و شادمان ہوتی ہے یا پھر کسی قسم کا تکدر اور بوجھہ محسوس کرتی ہے - اگر ہم اس سوال کو دو چھوٹے ٹکڑوں میں توڑ دین تو جواب میں سہولت ہوگی - پہلا ٹکڑا اس سوال پر مشتمل ہوگا کہ کیا صاحب فن ایسی قدور کا اظہار کرسکتا ہے جس سے اس کی طبیعت مکدر ہو یا جو اسے ناگوار معلوم ہو - اگر یہ اظہار ممکن ہے تو کیسے ممکن ہے ؟ اس کا کوئی شافی جواب ناممکن ہے کیونکہ بیشتر صاحبان فن کی صنعتوں کو دیکھنے کے بعد براہ راست اس بات کا ثبوت نہیں ملتا کہ تخلیق کے وقت صاحب فن کے جذبات پر کس شے کا کیسا اثر پڑتا ہے - ایک ہی چیز کو مختلف حضرات دیکھتے ہیں اور مختلف قسم کے خیالات کا اظہار کرتے ہیں اور مختلف قسم کی صنعتیں تیار کرتے ہیں - اس لئے کوئی حکم نہیں لگایا جاسکتا کہ فلاں چیز کو

دیکھنے کے بعد فلاں قسم کا اثر ہوتا ہے - زیادہ سے زیادہ قیاس سے کام لیا جاسکتا ہے - مثلاً ایک صاحب فن کسی چیز کی طرف عقلی یا غیر جمالیاتی نظر سے دیکھتا ہے تو ممکن ہے وہ چیز اسکو بھدی ' بد وضع اور ناگوار معلوم ہو اور اسکی طبیعت میں تکدر پیدا کردے لیکن اگر اسی وقت تخیل کا عمل شروع ہوگیا تو وہی چیز رفتہ رفتہ اپنی بد وضعی اور بدصورتی چھوڑ کر حسین ہوجائیگی اور پھر صاحب فن کی خواہش اظہار اس کے انقباض طبیعت کو کم اور اسکو اپنے مضمون سے قریب تر کردیگی - میر انیس کے مرثیوں میں یہ بات نظر آتی ہے کہ جب وہ اپنے تخیل سے کربلا کا نقشہ کھینچتے ہیں تو وہ بھیانک پن نظر نہیں آتا جس سے روح لرز اٹھے - وہاں گلاب کےپھول کھلتے ہیں اور چرخ اخضری پر آفتاب بھی نکلتا ہے تو گلاب کے پھول کی طرح کھلتا ہے - صبح کے منظر سے یہ بالکل معلوم نہیں ہوتا کہ کوئی انتہائی سنسان اور وحشت ناک جگہ ہے جہاں کوئی یار و غمگسار نہیں بلکہ مرغان چمن درختوں پر چہکتے ہیں ' ٹھنڈی ہوا چلتی ہے ' پھول مہکتے ہیں ' سبزہ لہکتا ہے اور جب شبنم روتی ہے تو سارا صحرائے کربلا زمرد کی زمین بن جاتا ہے جس پر موتیوں کا فرش بچھا ہوا ہے - کبھی دشت وغا خلد بریں کا نمونہ بنتا ہے اور کبھی دامن صحرا موتیوں سے بھر جاتا ہے - میں بالکل یہ نہ کہونگا کہ موقع تو یہ تھا کہ کربلا کے ذرہ ذرہ سے بھیانک پن ٹپکتا کیونکہ یہ تو صاحب فن کی اثر پذیری کی خاصیت پر ہے کہ وہ کیا اثر لیتا ہے - اتنا البتہ ماننا پڑیگا کہ شاعر کے دل پر کچھ اور ہی اثر ہے - یہ اثر کیسے ہوا اس کا پتہ چلنا ذرا مشکل ہے - لیکن اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی چیز دیکھکر صاحب فن کے دل پر نہایت وحشت‌ناک اثر ہو اور اس اثر کا اظہار آرٹ میں صاف نمایاں ہو - مشہور روسی افسانہ نگار ٹالسٹائے کا

ایک افسانہ "سیبستو پول" ہے جس میں اس نے جنگ کریمیا کی لڑائیوں کا حال لکھا ہے - چوتھے مورچہ کی لڑائی تو خاص طور پر قابل ذکر ہے - میدان جنگ میں سپاہیوں کے سر اور اعضاء خزاں دیدہ پتوں کیطرح اس طور پر گرتے ہیں کہ دل ہل جاتا ہے اور کشت خوں کا بے پناہ منظر نظر کے سامنے پھرنے لگتا ہے - اور اس وحشت ناک اثر کے باوجود آپ اس منظر سے دلچسپی کا اظہار کرتے ہیں- اسی ضمن میں ابھی حال میں ایک جرمن مصنف کا جو مشہور افسانہ All Quiet on Western Front کے نام سے شائع ہوا ہے ذکر کے قابل ہے - اس میں بھی آگ اور خون کے کھیل کا جس بھیانک انداز کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے اس سے جنگ کی ہیبت دل پر بیٹھ جاتی ہے - مگر آپ بار بار اسے پڑھتے ہیں - اور اس سے دلچسپی کا اظہار کرتے ہیں -

اس لحاظ سے یقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ کسی خاص چیز کا کوئی خاص اثر کیا ہوگا - اثر کی خاصیت کا دار و مدار تو سراسر صاحب فن کی شخصیت پر ہے - ہاں اگر تخیل سے مدد لیکر قیاس آرائی کی جائے تو کچھ نہ کچھ ضرور معلوم ہوگا کہ یہ اظہار کیوں ہوتا ہے - بات یہ ہے کہ ایک چیز سے طبیعت میں تکدر پیدا ہوسکتا ہے مگر ساتھ ہی ساتھ طبیعت اس سے دلچسپی کا اظہار بھی کرسکتی ہے اور اس کی طرف راغب ہوسکتی ہے - یہ دلچسپی کئی صورتوں میں ظاہر ہوتی ہے - مثلاً کسی شے سے آپ کو نفرت ہے - اس نفرت کی بنا پر آپ اس سے علیحدہ تو ہیں مگر بے تعلق نہیں کیونکہ اس شے کا خیال آپ کے ذہن میں موجود ہے اور ایک طرح کی دلچسپی ہے - اس کو مرزا غالب نے ایک لطیف طریقہ سے ادا کیا ہے :—

قطع کیجئے نہ تعلق ہم سے
کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

عداوت ہے مگر بے خبری نہیں اور کم سے کم دلچسپی کا یہ اظہار بہت کافی ہے - اسی طرح ایک چیز جو بظاہر خراب اور مہلک ہے اس سے دلچسپی کا اظہار ہوتا ہے - جیسے ڈاکٹر مہلک بیماریوں سے تجربہ کی خاطر دلچسپی کا اظہار کرتے ہیں تاکہ ان کی حقیقت اور ان کے خواص سے آگاہی ہو - پھر اسی طرح کتنے لوگ اپنی بعض خواہشات کو پورا کرنے کے لئے جس میں نقصان کا اندیشہ ہو کتنی ناجائز حرکات کے مرتکب ہوتے ہیں اور ان سے لطف اٹھاتے ہیں - یا پھر نفسی ارتقاء کے ابتدائی دور میں طبیعت سنسنی پھیلانے والی چیزوں کی طرف راغب ہوتی ہے خواہ ان سے تکیف ہی کیوں نہ ہو - آپ نے دیکھا ہوگا کہ اگر کہیں کوئی ہنگامہ ہوجائے اور گولی چلتی ہو اور لوگونکی جانیں جا رہی ہوں پھر بھی خلقت اس خطرہ کے باوجود ٹوٹی پڑتی ہے - اس بھیڑ بھاڑ میں بیشتر نوجوان ہوتے ہیں جنکی امنگ ہرآن ایک نئی سرگرمی کی متلاشی اور ایک نئے جوش کا سامان ڈھونڈھتی رہتی ہے - اسی سرگرمی اور جوش میں ضرر کے اندیشہ سے بے پروا ان کی اندرونی خواہش کو جو اضطراب کی دلدادہ ہے سکون ملتا ہے اور ایک طرح کی مسرت حاصل ہوتی ہے - مندرجہ بالا مثالوں پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی چیز خواہ وہ کتنی ناگوار اور تکلیف دہ کیوں نہ ہو مگر جب اس سے دلچسپی ہوجاتی ہے تو اس دلچسپی میں بھی ایک طرح کا لطف ملتا ہے اور جب لطف ملتا ہے تو اس کا اظہار مثل دوسری چیزوں کے بھی آرٹ میں ہونا ممکن ہے -

دوسرا ٹکڑا اس سوال پر مشتمل ہے کہ خود صاحب فن کی اخلاقی زندگی کا اثر اس کے احساس جمال پر کیا پڑتا ہے ؟ یعنی اسکی روزمرہ زندگی جو بظاہر آرٹ سے الگ ہے اس کے احساس جمال پر کیسا اثر ڈالتی ہے - اس سوال کا جواب بھی دو طریقوں سے دیا جاسکتا ہے یعنی خود

صاحب فن کے اخلاق و کردار کا مطالعہ کیا جائے اور پھر یہ دیکھا جائے کہ اس کی زندگی کا اثر اس کے فن پر کیا پڑتا ہے یا پھر ہم ایک عام قیاس کی بنا پر یہ رائے قائم کرلیں کہ چونکہ صاحب فن کا آرٹ فلاں قسم کا ہے اس لئے صاحب فن کی اخلاقی زندگی بھی کم و بیش اسی طرح کی ہوگی - اگر اول الذکر طریقہ اختیار کیا جائے تو بڑی دقت اخلاق کی تعریف میں ہوگی - پھر صاحب فن کی زندگی کے صحیح صحیح واقعات کا ملنا اور ان کو صحیح صحیح سمجھنا بڑا مشکل ہوگا - ان مشکلات کی وجہ سے عام طور پر یہ مشہور ہوگیا ہے کہ صاحبان فن کا پایہ اخلاق سے گرا ہوتا ہے - اگرچہ وہ بد نہ ہو مگر بدنام تو ضرور ہوتے ہیں - وہ رسوم کی پابندیوں سے بےفکر اور قیود کی زنجیروں سے آزاد ہوتے ہیں - اسکی وجہ خواہ کچھ ہی ہو مگر اتنا ضرور ہے کہ صاحب فن کی زندگی فکر و نظر کی زندگی ہوتی ہے اور چونکہ وہ ایک حساس دل اور نازک تخیل رکھتا ہے اس واسطے ذرا سے صدمہ کی بھی تاب نہیں لاسکتا اور ایک معمولی سی ٹھیس سے اس کا توازن طبع بگڑ جاتا ہے - پھر وہ جوشیلا ہوتا ہے اور جوش میں بعض وقت ایسی جلد بازی سے کام لیتا ہے اور نازیبا حرکتیں کر بیٹھتا ہے کہ اگر تھوڑی دیر سوچتا تو شاید کبھی نہ کرتا - تخیل کی اس نزاکت اور طبیعت کی اس امنگ اور جوش سے اس کے دماغی فعل پر اثر پڑتا ہے جس سے اکثر اسکی شہوانی زندگی کا توازن بگڑ جاتا ہے - اس سے اکثر لوگ اس نتیجہ پر پہونچے ہیں اور اسکو ایک طرح کی سند بھی قرار دیدی ہے کہ صاحب فن کو رسوم و قیود سے آزاد ہونا چاہئے - یہ نتیجہ جتنا مبالغہ آمیز ہے اتنا ہی مضحکہ خیز بھی ہے کیونکہ اس بیان کے مطابق اخلاق کی تعریف میں بہت کچھ مبالغہ سے کام لیا گیا ہے - اجارہ داران اخلاق جب اخلاق کا ذکر

کرتے ہیں تو سیرت کی اور بہت سی اچھائیوں اور برائیوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں اور صرف شہوانی زندگی کا اصول ان کے سامنے ہوتا ہے گویا ہماری اخلاقی زندگی کا بس یہی ایک پیمانہ ہے - یہ دائرہ اتنا تنگ ہوجاتا ہے کہ انسانی سیرت کے کتنے پہلو خواہ کتنے ہی تاریک کیوں نہ ہوں اس سے علیحدہ کردئے جاتے ہیں - اگر کوئی جھوٹ بولے ' ناجائز طریقہ پر دوسروں کی دولت ہضم کرے ' رشوت لے یا وظیفۂ ' دست غیب ' کا عامل ہو ' دوسروں کے مال پر غاصبانہ قبضہ کرلے ' خلق اللہ کو طرح طرح سے پریشان کرے تو یہ محض گناہ ہوگا مگر شاید بد اخلاقی میں شمار نہ ہو - ان لوگوں کے مطابق اخلاق تو اسی شخص کے خراب کہے جائیں گے جو اپنی جنسی زندگی میں رسم و رواج کے مطابق احتیاط نہیں برتتا - اس میں شک نہیں کہ جنسی زندگی شخصی و نیز سماجی زندگی کی ذمہ داریوں کے لحاظ سے اہمیت ضرور رکھتی ہے مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ ہم کسی شخص کی اخلاقی زندگی کا جائزہ لیتے وقت اس کی سیرت کے دوسرے پہلوؤں کو بھول جائیں اور صرف ایک ہی پیمانہ سامنے رکھیں - ایک گوشہ سے کل پر رائے قائم کرنا کہاں کا انصاف ہوگا - اس لحاظ سے اگر ہم کسی کی اچھائیوں پر نظر ڈالیں تو ہمکو دیکھنا چاہئے کہ اس میں شرافت نفس ' خود داری ' بلند ہمتی ' ہمدردی ' صداقت ' خلوص ' رواداری اور ایثار وغیرہ کہاں تک ہیں اور جب برائیوں کا جائزہ لیں تو یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ برائیوں میں بغض ' کینہ ' جھوٹ ' دغابازی ' مکاری ' خود غرضی ' پست ہمتی ' تنگ نظری وغیرہ بھی شامل ہیں - اگر ہم کسی صاحب فن کی سیرت کا مجموعی طور پر مشاہدہ کریں تو وہ شاید اتنا برا نظر نہ آئے جتنا کہ پہلے نظر آتا تھا - اگر اخلاق کا یہ وسیع مفہوم لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ کسی شخص کی سیرت کا جائزہ لینا کتنا مشکل ہے اور اگر کہیں

وہ شخص ہم سے دور ہے یا مرچکا ہے یا ہم تک اس کے متعلق جو اطلاعات پہونچی ہیں اُن کا دار و مدار محض روایتوں یا کتابوں پر ہے تو اس صورت میں کوئی صحیح رائے قائم کرنا اور بھی مشکل ہوجائیگا -

• اچھا اگر ہم دوسرا طریقہ اختیار کریں اور صاحب فن کے آرٹ سے اس کی اخلاقی زندگی کا حال معلوم کرنا چاہیں تو یہاں بھی ہم کو قیاس سے کام لینا پڑیگا اور ظاہر ہے کہ اس میں حزم و احتیاط کی کتنی ضرورت ہوگی کیونکہ اکثر شراب و ساقی ' رندی ومستی ' رقیب و نامہ بر کے پردوں میں صاحب فن اپنی اخلاقی زندگی چھپا لیتا ہے - عمر خیام کا کلام دیکھ کر بہتوں کو دھوکا ہوا کہ خیام ایک بے فکر ' شاہد پرست اور رند مشرب شخص تھا جو ہر وقت بدمست رہتا اور جس کو سوائے شغل بادہ و ساغر کے اور کوئی کام ہی نہیں تھا - مگر مولانا سید سلیمان ندوی کی تحریر سے خیام کے متعلق جو معلومات ملتی ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ یہ چیزیں محض لازمۂ سخن تھیں جو صرف تشبیہ و استعارہ کی غرض سے استعمال کی گئیں ہیں ورنہ اپنی اخلاقی زندگی میں وہ ایک اعلیٰ اصول کا پیرو تھا -

جیسا میں پہلے بتا چکا ہوں ہر صنعت عظیم میں زندگی کا عکس نظر آتا ہے اور حقیقت اس پر اپنا سایہ ڈالتی ہے - اس لحاظ سے وہ لمحہ جس میں صاحب فن پر ان بلند قدور کا انکشاف ہوتا ہے یقیناً ان لمحوں سے برتر اور زیادہ بزرگ ہے جن میں صرف معمولی معمولی چیزیں معلوم ہوتی ہیں - اگر آرٹ کا مقصد فکر و نظر کی مدد سے زندگی کو ایک روحانی بلندی پر لیجانا ہے اور اگر اخلاق کا مقصد بھی یہی ہے کہ عمل سے روح کو بلند کیا جائے تو پھر اخلاق اور آرٹ یقیناً

ایک دوسرے کے معاون ہوں گے اور ان دونوں میں کوئی تصادم ناممکن ہوگا فن میں ایک بلند روحانی زندگی کا عکس نظر آتا ہے اور اس عکس کو پیدا کرنے کے لئے صاحب فن اپنی تمام انسانی صلاحیتوں کو جن میں اخلاقی صلاحیتیں بھی شامل ہوتی ہیں حتی الوسع بروئے کار لاتا ہے۔ اس لئے بغیر بلند اخلاقی نظر کے فن بھی بلندی پر نہیں پہونچ سکتا - کسی شخص کی شاعری اگر اپنے اندر عظمت رکھتی ہے تو اس میں بلند اخلاقی نظر کا پایا جانا ضروری ہے - اس لحاظ سے تنقید کے وقت ہم دیکھنا چاہتے ہیں کہ شاعری کا جو آئینہ اس نے تیار کیا ہے اس میں زندگی کا عکس کیسا نظر آتا ہے ؛ پھر یہ عکس جزوی ہے یا کلی ہے - اگر صاف ہے اور کل کا ہے تو یقیناً فن میں عظمت ہے اور شاعر ایک بلند پایہ شاعر ہے - اور اس میں بلند اخلاقی نقطہ نظر بھی ضرور موجود ہوگا -

شاعری اور پیغمبری

لیکن صاحب فن یا شاعر میں بلند اخلاقی نقطہ نظر پائے جانے کے یہ معنی نہیں کہ اس کا شمار ان معلمین اخلاق میں ہے جو پیغمبر کے نام سے ملقب ہیں اور جنکی زندگی انسانوں کے اخلاق درست کرنے پر وقف ہوئی ہے جو خود سراسر اخلاق کا مجسمہ تھے اور جن سے اہل زمانہ درس اخلاق و پاکیزگی لیتے رہے ہیں - یہ وہ بلند مرتبہ ہے جہاں انتہائی بلندی نظر کے ساتھ انتہائی ذوق عمل بھی ہوتا ہے اور یہ صفت پیغمبری ہے - البتہ صاحب فن کے یہاں اخلاق ہونے سے مراد یہ ہے کہ وہ اپنے فن میں اخلاقی قدور کا اظہار کرتا ہے مثلاً جب کسی افسانہ یا ڈرامہ میں کوئی ظالم بادشاہ اپنے تاج و تخت سے محروم ہوکر ذلت و خواری کی زندگی بسر کرتا ہے تو ہم خوش ہوتے ہیں کہ وہ اپنے کیفر کردار کو پہونچ گیا - تنقید کا یہ معیار بالکل اخلاقی ہے

کیونکہ ظلم کی سزا بھی تھی کہ ایک ظالم کو سخت سے سخت خمیازہ برداشت کرنا پڑے -

شاعر اور پیغمبر میں ہم رنگی ہوتی ہے اور فرق بھی - ہم رنگی کی مثال تو یہ ہے کہ شاعر کا اخلاقی نقطہ نظر بھی اُسی خزانہ سے عطا ہوتا ہے جہاں سے پیغمبر کو پیغمبری ملتی ہے - دونوں اعلیٰ درجہ کے صاحب نظر ہوتے ہیں اور زندگی کی حقیقتوں کو دیکھتے اور سمجھتے ہیں - اسی لئے کہا گیا ہے شاعری جزویست از پیغمبری یعنی جہاں تک نظر کا تعلق ہے شاعری پیغمبری کا ایک جزو ہے اور بس - مگر پیغمبری کا درجہ شاعری سے اس واسطے بلند ہے کہ پیغمبر میں کمال بالغ نظری کے ساتھ اعلیٰ درجہ کا ذوق عمل بھی ہوتا ہے مگر شاعر کے اعمال و اقوال میں بڑا فرق ہوتا ہے - شاعر کی زندگی محض فکر و نظر کی زندگی ہوتی ہے - وہ مرغ قبلہ نما کی طرح تڑپتا ہے اور احساس رکھتا ہے مگر دل میں نہ تو وہ ذوق عمل اور نہ قدم میں وہ روانی ہوتی جو پیغمبر میں ہوتی ہے - بحیثیت شاعر کے اس سے عمل کی خواہش رکھنا اس کو اپنے حلقہ سے باہر نکلنے کی دعوت دینا ہے - لیکن اگر کسی شخص کی زندگی میں یہ دونوں خصوصیتیں خواہ کسی حد تک بھی سہی جمع ہوجائیں تو سمجھنا چاہئے کہ اس پر پیغمبری کا عکس پڑ رہا ہے -

اس لحاظ سے ہم شاعر یا صاحب فن سے کسی عمل کے خواہاں نہیں ہوتے بلکہ یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ اس میں تخیل کے ساتھ ساتھ ہمدردی ' رواداری ' محبت ' اخلاق ' وسیع النظری ' لوگوں کو سمجھنے کی خواہش ' اور اجزا کو ایک کل کی صورت میں ترتیب دینے کی تمنا ہے یا نہیں اور اگر ہے تو کہاں تک ہے کیونکہ یہی چیزیں ہیں جنکو آرٹ

کی ضرورت ہوتی ہے اگر صاحب فن کی روزمرہ زندگی ان چیزوں سے خالی ہے تو بھلا اس کے آرٹ میں یہ چیزیں کہاں سے آئیں گی کیونکہ ان صلاحیتوں کی کمی اس کے آرٹ پر خراب اثر ڈالے گی - لیکن اگر یہ صفات اس کی اخلاقی زندگی کا جزو ہیں تو یقیناً اس کے فن پر اچھا اثر پڑیگا - اعمال صالح سے نظر صالح اور بلند ہوتی ہے - مولانا روم فرماتے ہیں :—

صحبت صالح ترا صالح کند

صحبت طالح ترا طالح کند

صالح سے مراد یہی بلندی نظر ہے یعنی نیکوں کی صحبت سے تخیل بلند ہوتا ہے اور انسان و کائنات سے ہمدردی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے جس سے روح کو سرور ملتا ہے - اور طالح سے مراد مندرجہ بالا صفات کا فقدان ہے -

ایک صاحب فن جس کی اخلاقی زندگی بلند نہیں ہے ممکن ہے ایک اچھا دستکار ہوجائے مگر اعلیٰ درجہ کا صاحب فن نہیں ہوسکتا - اس میں ممکن ہے تھوڑی بہت تخیل کی صلاحیت ہو اور کسی حد تک جذبات بھی ہوں مگر اس میں تناسب کا فقدان ضرور ہوگا کیونکہ وہ کسی چیز کو کل کی حیثیت سے نہیں دیکھ سکیگا اور کل کی عظمت اس کے ذہن میں نہیں آئے گی اس لئے وہ آرٹ کا رابطہ اخلاق کے ساتھ نہیں دیکھ سکتا کیونکہ جہاں انسان کی روحانی بلندی اور کائنات کا مجموعی طور پر جائزہ لیا جاتا ہے وہاں آرٹ اور اخلاق جاکر مل جاتے ہیں اور یہ بلندی اس کے پست تخیل سے بہت دور ہے - تخیل کی یہ بلندی جہاں آرٹ اخلاق کا معاون ہوتا ہے حاصل کرنا آسان نہیں - مدتوں کی تربیت اور مدتوں کی پرورش

کے بعد یہ جوہر پختہ ہوتا ہے - صاحب فن کو اپنی روح کا راز فاش کرنے کے لئے ایک زمانہ درکار ہے :—

قرنہا باید کہ تا یک سنگ اصلی ز آفتاب
لعل گردد در بدخشان یا عقیق اندر یمن

اول صاحب فن کو کمال غور و فکر سے اپنی صلاحیتوں کا جائزہ لینا پڑیگا ، اپنی فطرت کو پرکھنا پڑیگا اور پھر سالہا سال کی محنت و مشقت اٹھانی پڑیگی تب کہیں اس کو دیدہ بینا عطا ہوسکتا ہے اور وہ اس کائنات کا راز دار بن سکتا ہے -

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

گو محنت و مشقت اس سفر کا ایک ضروری زاد راہ ہے مگر منزل تک پہونچنا اس کا لازمی نتیجہ نہیں کیونکہ :—

این دولت سرمد ہمہ کس را نہ دہند

لیکن یہ کیا ضروری ہے کہ ہر صاحب فن بزرگ ہی ہو اور اسکی نگاہ کہکشاں تک پہونچے - زندگی کی اور بھی تو معمولی معمولی حقیقتیں ہیں جن کا جاننا ضروری ہے - اگر گلاب خوبصورتی کے ساتھ خوشبو بھی رکھتا ہے تو لالۂ صحرائی میں بھی ایک شان دلفریبی اور دلاویزی پائی جاتی ہے - اگر میدان نہ ہوں تو پہاڑ کی عظمت کا اندازہ کیسے ہوگا - اگر تالاب نہ ہوں تو سمندر کی وسعت کس کے خیال میں آسکتی ہے - اگر چھوٹی حقیقتوں کا حال نہ معلوم ہو تو بلند حقیقت کا خیال کیسے ذہن میں آئیگا - اس لئے معمولی درجہ کا صاحب فن بھی اعلیٰ درجہ کے فن کے سمجھنے اور اس کی ترقی میں خاصی مدد کرتا ہے -

منجملہ اور اخلاقی صفات کے صاحب فن میں اخلاص کا ہونا ضروری

آرٹ اور اخلاص

بلکہ اشد ضروری ہے - اس سے دو طرح کا اخلاص مراد ہے ایک تو اخلاقی اخلاص اور دوسرا فنی اخلاص - اخلاقی اخلاص سے عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ کسی کو جان بوجھ کر دھوکا نہ دیا جائے یعنی قول و فعل میں ہم آہنگی ہو اور ضمیر ریا کاری کی آلائش سے پاک ہو ۔ لیکن اگر کسی شخص کی روزمرہ زندگی اس قسم کی ہے کہ وہ لوگوں کو فریب دیتا ہے ، اور جعل سازی کرتا ہے اور وہ صاحب فن بھی ہے تو اُس کے فن پر اس عادت کا مثل دوسری اخلاقی خرابیوں کے ناگوار اثر پڑنا لازمی ہے -

لیکن فن میں جس چیز کی اشد ضرورت ہے اور جس کے بغیر کوئی فن فن نہیں ہوسکتا وہ صاحب فن کا خود اپنی ذات سے ایک رشتۂ اخلاص قائم کرنا ہے - اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کو صرف انہیں چیزوں کا اظہار کرنا چاہئے جن کا اس کے دل پر اثر ہوتا ہے - بقول مرزا کے :—

؎ تب ناز گراں مائگی اشک بجا ہے
جب لخت جگر دیدۂ خونبار میں آوے

یعنی اس اظہار میں اس کو انتہائی خلوص و صداقت سے کام لینا چاہئے اور جو کچھ اس کے دل میں ہے وہی زبان پر ہونا چاہئے - ایسا نہ ہو کہ آج کچھ کہا اور کل اس کا بالکل مخالف - واضح رہے کہ صاحب فن کی طبیعت میں نشو و نما ہوتی ہے مگر تضاد و تخالف نہیں ہوسکتا - یہ ممکن ہے کہ جو چیز آج چھوٹی ہے کل بڑھکر بہت بڑی ہوجائے مگر یہ نہیں ہوسکتا کہ وہ سرے سے غائب ہوجائے اور دوسری بالکل مخالف چیز اس کی جگہ لیلے - اگر صاحب فن خود اپنی ذات سے اخلاص نہیں برتتا ، ریاکار ہے اور دل میں کچھ اور رکھتا ہے اور زبان سے کچھ

اور کھتا ہے تو نہ صرف اس کی اخلاقی زندگی خراب ہوگی بلکہ اس کی صنعت بھی بالکل بد صورت اور خستہ حال ہوگی - جو صاحب فن اس قسم کے زہریلے اثر میں مبتلا ہے وہ نہ صرف بحیثیت انسان کے بلکہ بحیثیت صاحب فن کے بھی محض ایک دھوکا ہے ' ایک فریب ہے اور سراب سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا اس ریاکاری کی بین مثال اس وقت نمایاں ہوتی ہے جب صاحب فن کسی غیر جمالیاتی خیال سے متاثر ہوکر خود فریبی میں مبتلا ہو جاتا ہے اور فن کو ایک آلۂ کار بناتا ہے مثلاً نام و نمود کی خواہش ' شہرت کی آرزو ' روپیہ پیدا کرنے کے شوق کو فن کی مدد پہونچاتا ہے یعنی فن کو کسی غیر جمالیاتی مقصد کے حصول کے لئے استعمال کرتا ہے - اس صورت میں اس کا فن نہ صرف ناقص ' خام اور بے روح ہوجاتا ہے بلکہ اس کے احساس جمال میں بھی فرق پڑ جاتا ہے ظاہر ہے کہ فن کے مذہب میں اس سے بڑا اور کوئی گناہ نہیں - لیکن یہ بھی اکثر دیکھا گیا کہ اخلاص کے باوجود صنعت اچھی نہیں ہوتی - اس کی وجہ یہی ہوسکتی ہے کہ صاحب فن اصطلاحات کی مشق میں یا تو کچا ہے ' کافی محنت نہیں کرتا : تخیل میں جوش پیہم نہیں دکھاتا یا پھر اتنا بلند ہے کہ اصطلاحات اس کے تخیل کا پورے طور پر بار نہیں اٹھا سکتے -

اچھا اب اس بحث کا دوسرا بڑا حصہ لیجئے یعنی اظہار سے قبل صاحب فن کے دماغ میں جو قدور ہیں اور جو متشکل ہونے والی ہیں ان کا اس کی صنعت پر کیا اثر پڑتا ہے اس سوال کو بھی اگر دو ٹکڑوں میں توڑ دیں تو جواب آسان ہوگا پہلے تو یہ دیکھنا پڑیگا کہ جو قدور طبیعت پر اچھا یا ناگوار اثر ڈالتی ہیں ان کا صنعت پر کیا اثر پڑتا ہے - پھر یہ دیکھنا پڑیگا

که اخلاق کے لحاظ سے قدور کے روشن و تاریک پہلوؤں کا صنعت پر کیا
اثر پڑتا ہے - یہ دونوں ٹکڑے گو الگ کردئیے گئے ہیں مگر درحقیقت
الگ نہیں کیونکہ جو چیز اخلاق سے گری ہوئی ہے وہ ناگوار اثر پیدا
کرسکتی ہے اور جو چیز ناگوار ہے وہ مخرب اخلاق کہی جاسکتی ہے -
اسی طرح جو چیز اچھا اثر ڈالتی ہے اس کا شمار پسندیدہ اخلاق میں
ہوسکتا ہے اور جو چیز اخلاق کے لحاظ سے بہتر ہے وہ اچھا اثر ڈال سکتی
ہے - لیکن مناسب یہی ہے کہ ان دونوں پہلوؤں کو الگ ہی رکھا جائے
تاکہ نفس مسئلہ اچھی طرح ذہن نشین ہوجائے - یہاں ایک ضروری
عملی سوال یہ ہوتا ہے کہ کیا آرٹ کے لئے اخلاقاً اچھا یا خراب ' پسندیدہ '
اور ناگوار الفاظ استعمال کئے جا سکتے ہیں کیونکہ بعض لوگوں کا خیال ہے
کہ جب کسی چیز کا آرٹ میں اظہار ہوتا ہے تو ان الفاظ کا استعمال اس
جگہ غریب اور بے محل نہیں ہوتا اس واسطے کہ کسی ناگوار یا بد اخلاق
چیز کا جب آرٹ میں اظہار ہوتا ہے تو اظہار اس کو دل خوش کن بنا
دیتا ہے اور اور ان سے وہ تنغض اور تخریبی کیفیت نظر انداز ہوجاتی ہے -
اس میں شک نہیں کہ صاحب فن کو کسی چیز کے اظہار سے خواہ وہ کچھ
ہی ہو مسرت ضرور ہوتی ہے مگر کیا اس اظہار میں چیزوں کی قلب
ماہیت ہو جاتی ہے ؟ کیا کسی شے کے ناگوار یا پسندیدہ عمدہ یا مخرب
پہلو غائب ہوجاتے ہیں ؟ میری رائے میں تو کبھی یہ پہلو غائب
نہیں ہوتے - بلکہ دوسرے پہلوؤں کے ساتھ مقابلہ و موازنہ کی کیفیت پیدا
کرتے ہیں - اچھا پہلے اخلاقی پہلو کو لیجئے - کسی صنعت کی تنقید ہمیشہ
اخلاق کی کسوٹی پر ہوتی ہے - جس طرح ہم یہ دیکھتے ہیں کہ فرد کا
سوسائٹی سے کیا تعلق ہے اسی طرح آرٹ میں ہم دیکھتے ہیں کہ ایک جزو کا
دوسرے جزو سے اور پھر کل سے کیا تعلق ہے - پھر یہ بھی دیکھتے ہیں کہ جو

فرض کسي جزو کے ذمہ ڈالا گیا ھے آیا وہ اسکو اچھي طرح ادا کرتا ھے - تنقید کا یہ پیمانہ آخر اخلاقی ھی تو ھے لیکن ھماري روزمرہ زندگی کے لئے جو اخلاقی پیمانہ ھوتا ھے اس میں اور آرٹ کے جانچنے کے لئے جو اخلاقی پیمانہ ھوتا ھے اس میں ذرا فرق ھوتا ھے - اخلاق کا کام ھماری روزمرہ زندگی کو درست کرنا اور سنوارنا ھے اور ایسے اصول وضع کرنا ھے جس سے افراد اور جماعت میں تصادم نہ ھو - ظاھر ھے کہ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے عملی پہلو کا بہت کچھ جائزہ لینا پڑتا ھے' لوگوں کی کمزوریوں پر نظر ھوتی ھے اور سوسائیٹی کو اخلاقی حیثیت سے بلند کرنے کا خیال ھوتا ھے لیکن فن کی دنیا خود ایک مستقل حیثیت رکھتی ھے اور اس لحاظ سے فن پر ھم اخلاقی نقطۂ نظر سے جو تنقید کرتے ھیں اسمیں صرف جمالیاتی پہلو نمایاں ھوتا ھے- آپ میر انیس کے مراثی پڑھتے ھیں تو آپکو مختلف اشخاص کے مختلف کردار نظر آتے ھیں - کوئی شخص جاں نثاری میں فرد ھے ' کوئی بہادری میں یکتا ھے ' کوئی محبت و غمگساری میں بےمثل ھے کوئی حقگوئي میں بےنظیر ھے - سیرت کے ان پہلوؤں پر جب آپ غور کرتے ھیں اور ان کو بے مثل اور یکتا کہتے ھیں تو آپ انہیں آخر اخلاق ھی کی نگاہ سے تو دیکھتے ھیں - اسی طرح آپ اگر ایک ڈرامہ دیکھ رھے ھوں جس میں کسی شخص کے ساتھ ظلم یا زیادتی کي گئی ھو تو آپ کا دل کڑھتا ھے ' آپکو تکلیف ھوتی ھے ' آپ غیظ میں آجاتے ھیں اور آپکے جذبات بھڑک اُٹھتے ھیں - کیوں ؟ اس لئے کہ ظلم عمدہ اخلاق کے خلاف ھے - لیکن اسکے باوجود وھاں آپکا جذبہ جمالیاتی ھوتا ھے یعنی آپ اس ظلم کی تلافی چاھتے تو ھیں مگر یہ خواھش ھوتي ھے کہ ڈرامہ کے اندر ھی ظالم کو سزا مل جائے - یہ تو نہیں ھوتا کہ ظلم تو ھو ڈرامہ کے اندر اور آپ اسکی عملی تلافي کرنے لگیں کیونکہ وھاں مقصد تو صرف روحانی اور اخلاقی احساس ھے اخلاقی عمل نہیں - وھاں اخلاقی نقطۂ نگاہ

سے مراد صرف قدروں کی جانچ اور سیرت کی تشریح ہے - مگر یہ جانچ اخلاقی زندگی کے نصب العین کو سامنے رکھکر کی جاتی ہے یعنی آپ عمدہ سے عمدہ اخلاق کی روشنی میں سیرت کی تنقید کرتے ہیں - اس لئے ڈرامہ میں جب آپ کسی کی سیرت کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ دیکھتے ہیں کہ اس میں انسانیت و شرافت کا جوہر کہاں تک ہے - آیا وہ اپنی ذمہ داریوں سے گریز کرتا ہے یا مردانہ وار انکا مقابلہ کرتا ہے - پھر اگر ظلم کو شکست ہوتی ہے اور بدی کا بیڑا غرق ہوتا ہے تو آپ خوش ہوتے ہیں کہ یہ چیزیں اپنے کیفر کردار کو پہونچ گئیں - اس لحاظ سے آرٹ میں اخلاقی زاویہ نگاہ تو ہوتا ہے مگر اخلاقی عمل نہیں ہوتا -

آرٹ میں یہ اخلاقی زاویہ نگاہ جیسا ہم بتا چکے ہیں عمدہ اخلاق سے مترتب ہوتا ہے یعنی ہماری اخلاقی زندگی کے بلند ترین نصب العین کا عکس آرٹ پر پڑتا ہے - لیکن اخلاقی زندگی کے عملی پہلوؤں کی تکمیل اُسی وقت ہوتی ہے جب انسان ان پہلوؤں کے منشا کے متعلق غور کرے اور نفس پر ان کے اثر کو سمجھنے کی کوشش کرے کیونکہ صحیح اخلاقی زندگی وہی ہوتی ہے جس میں نظریہ اور عمل میں ہم آہنگی ہوتی ہے - اگر عمل کے نظری پہلوؤں سے نگاہ آشنا نہیں تو عمل بے روح ہوگا - اس لئے جب ہم کسی چیز کے نظری پہلو پر زور دیتے ہیں یعنی اس کو صرف تخیل اور تصور کی نظر سے دیکھتے ہیں تو وہ چیز فن میں داخل ہو جاتی ہے اور جب سوسائٹی کی بہتری کے لحاظ سے اس کے عملی پہلو پر نگاہ ہوتی ہے تو اس کا شمار اخلاق میں ہوتا ہے - اس طرح فن کی حیثیت سے جب کوئی چیز پیش کی جاتی ہے تو اس کا مقصد عمل کرنا یا عمل کی تلقین کرنا نہیں ہوتا بلکہ تصور و تخیل کے لئے صرف اخلاقی نقطۂ نگاہ پیش کرنا ہوتا ہے -

جس طرح آرٹ پر عمدہ اخلاقی قدور کا اثر پڑتا ہے اسی طرح نا پسندیدہ اور مخرب اخلاق قدور کا بھی اثر پڑتا ہے - آرٹ میں ان نا پسندیدہ اور مخرب اخلاق قدور کی حیثیت ہماری روز مرہ زندگی سے مختلف ہوتی ہے مثلاً اگر ہم کسی کو کوئی اخلاقی جرم کرتے دیکھتے ہیں تو اس کو روکنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس کوشش کے لئے عملی قدم بڑھاتے ہیں مگر آرٹ کي دنیا میں ہم کو اس جرم کے صرف خراب ہونے کا احساس ہوتا ہے-ہماري طبیعت میں اس سے انقباض و تکدر کی کیفیت پیدا ہوتی ہے اور ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ ایسا نہ ہوتا تو اچھا ہوتا اور اگر ہوگیا تو آرٹ ہی میں اس جرم کی سزا بھی دیجائے - بہرحال ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اگر صنعت میں ان نا پسندیدہ اور مخرب اخلاق قدور کا ظہور ہوتا ہے تو کیونکر ہوتا ہے؟ اگر آپ کسی ایسی قدر کا جس سے طبیعت میں انقباض پیدا ہو آرٹ میں محض اس قدر کی غرض سے اظہار کریں تو یہ قدر بے کیف ہوگی - کسی تکلیف یا غم کا حال صرف غم کے لحاظ سے کون سنے گا اگر آرام و مسرت کا خیال ساتھ ساتھ نہ ہو - نا پسندیدہ قدور تو ہم صرف اس لئے پیش کرتے ہیں تاکہ پسندیدہ قدور کی اہمیت واضح ہوجائے - اگر آرٹ میں بد اخلاقی کا ذکر محض بد اخلاقی کی غرض سے کیا جائے تو وہ کوئي بڑا آرٹ نہ ہوگا کیونکہ خالص منفي قدروں کا ذکر جب تک ان کا سلسلہ اثبات والي قدروں کے ساتھ نہ ہو بے پشت اور بے نتیجہ ہوگا - بد اخلاقی کی اہمیت اگر ہے تو بس اتني ہے کہ وہ نیکی کے رخ کو اور واضح کردے - ظلم ' جبر ' دغا بازی ' ہوس رانی وغیرہ کا ذکر اگر آرٹ میں آتا ہے تو لا محالہ کسی بلند اخلاقي صفت کو واضح کرنے کے لئے آتا ہے ورنہ بذاتہ یہ چیزیں خوشنما نہیں معلوم ہوتیں انسانی صفات کی ترقی کے لئے جس طرح نیکی کے ساتھ بدی کا ہونا

لازمی ھے اسي طرح فن کی دنیا میں نا پسندیدہ اور مخرب اخلاق قدروں کا اظہار ضروري ھے - پھول کے ساتھ کانٹا نہ ھو تو پھول مکمل پھول نہ ھوگا اور کانٹے کي حیثیت یہاں محض کانٹے کي نہیں ھے بلکہ پھول کی دیدہ زیبي اور خوبصورتی کو بلند کرتی ھے - مرزا نے کیا خوب کہا ھے :—

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتي
چمن زنگار ھے آئینۂ باد بہاری کا

گوئٹے نے اپنے مشہور ڈرامہ فاوسٹ میں شیطان کی بھي یہی حیثیت رکھی ھے یعني شیطان انسان کی اخلاقی ترقی کے لئے ایک ناگزیر شے ھے اور بغیر اس شے پر کامرانی حاصل کئے ھوئے انسان اخلاقی کمال نہیں حاصل کرسکتا - میر انیس نے اپنے مراثی میں یزیدي افواج کا حال ان کی شقاوت ' انکي بے رحمی ' انکي جاہ پسندی و دنیاداری کا ذکر بڑے جوش سے کیا ھے مگر اس جوش بیان سے مقصد محض ان ناپسندیدہ چیزوں کا اظہار نہیں ھے بلکہ ان میں رنگ اس لئے بھرا گیا ھے تا کہ جو چیز مقابل میں پیش کی گئی ھے وہ اچھی طرح صاف اور روشن ھو جائے - مثلاً یزیدی فوج کے ایک سپاھي کا حال سنئے :—

بالا قد ' و کرخت و تنو مند و خیرہ سر
روئیں تن و سیاہ دروں آھني کمر
ناوک پیام مرگ کے ' ترکش اجل کا گھر
تیغیں ھزار ٹوٹ گئیں جس پہ وہ سپر
دل میں بدی ' طبیعت بد میں بگاڑ تھا
گھوڑے پہ تھا شقي کہ ھوا پر پہاڑ تھا
ساتھ اس کے اور اسی قد و قامت کا ایک پیل
آنکھیں کبود ' رنگ سیہ ابروؤں پہ بل

بد کار و بد شعار و ستمگار پر دغل
جنگ آزما ' بھگائے ہوئے لشکروں کے دل
بھالے لئے کسے ہوئے کمرین ستیز پر
نازاں وہ حرب گرز پہ ' بہ تیغ تیز پر

اسی طرح ایک دوسرے موقع پر کہتے ہیں :—

نکلا ادھر سے بہر وغا ایک رو سیاہ
زور آور و تہمتن و مغرور و کینہ خواہ
کاندھے پہ گرز ' بر میں زرہ ' خشمگیں نگاہ
سر پر مثال قبضۂ تیغ آہنی کلاہ
آمد شقی کی تھی کہ رواں رود نیل تھا
ہیبت میں تھا جو دیو تو ہیکل میں پیل تھا

پھر عابد بیمار کا حال ' گرمی کی شدت' پیاس کی تکلیف' بیکسی و بے سر و سامانی کی داستان غرض کتنے ہی نا پسندید مضامین ہیں جو کئی رنگ سے باندھے گئے ہیں - یہ صرف اس لئے ہے کہ قافلۂ اہل بیت کی جواں مردی ' قوت برداشت ' خدا کی راہ میں سرکٹانے کی تمنا یعنی ان کی سیرت کے مختلف پہلو روشن اور واضح ہو جائیں - اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فن میں کسی نا پسندیدہ چیز کا ذکر محض اس چیز کی ذات سے وابستہ نہیں ہوتا بلکہ اس کا اثر دوسری اچھی قدروں پر پڑتا ہے - اور اگر دوسری اچھی قدروں پر اسکا اثرنہ پڑے تو وہ نا پسندیدہ قدر بالکل بے کیف اور بیکار ہو جائیگی - اس لئے فن میں ناپسندیدہ اور مخرب اخلاق چیزوں کا ذکر آنا ممکن ہے مگر انکی ایک حیثیت ہوتی ہے جو مخرب اخلاق نہیں ہوتی لیکن اگر یہی چیز اخلاق کے دامن پر دھبہ لگانے کی شہ دے اور بہیمانہ خواہشوں کو بے مہار کردے

تو وہ فن فن نہ ہوگا - اس لحاظ سے فن اور اخلاق میں ایک گہرا رشتہ ہے جس کو اگر علیحدہ کردیا گیا تو روح کا شیرازہ پریشان اور زندگی بے کیف ہو جائیگی -

---

نوٹ—اس مضمون کی تیاری میں حسب ذیل کتابوں سے مدد لی گئی ہے :—

۱—بانگ درا—سر محمد اقبال -

۲—شعرالعجم—شبلی نعمانی -

۳—موازنۂ انیس و دبیر—شبلی نعمانی -

۴—عمر خیام—سید سلیمان ندوی -

۵—نوجوان ورتھر کی داستان غم—گوئٹے - (مترجمۂ ریاض الحسن)

6. Mind and Reality—LORD HALDANE.

7. Mind and its Working—C. E. M. JOAD.

8. A. B. C. of Psychology—C. K. OGDEN.

9. My Life—ISADORA DUNCAN.

10. Dance of Life—HAVELCOK ELLIS.

11. The Essence of Aesthetic—B. CROCE.

12. Aesthetic—B. CROCE.

13. Encyclopaedia Britannica (Article on Aesthetics)—B. CROCE.

14. Towards a Theory of Art—L. ABERCROMBIE.

15. A Study in Aesthetics—L. A. REID.

16. Three Lectures on Aesthetic—B. BOSANQUET.

17. Oxford Lectures on Poetry—A. C. BRADLEY.

18. An Idealist View of Life—S. RADHAKRISHNAN.